ادبی تنقید کی معتبر آواز: پروفیسر ارتضیٰ کریم

کلیدی الفاظ: ادبی تنقید# نہج#دبستان# نفسیات# تنقیدی شعور#،ترتیب# تدوین

ڈاکٹر ارشاد سیانوی

Abstract: Prof. Irteza Karim is a great Fiction Writer. He wrote about 28 books. Although he written about one hundred Mazameen on Dastan, Novel, Afsana, Tamseel, Ghazal, Nazam, Marsiya, Qaseda etc. Many books become very famous as Quaratul ain Haidar ek mutala, Khuaja Ahmad Abbas, Dabistan Suhail Azemabadi, Tanqid ka pasmanzar, Urdu Fiction ki tandqid. Prof. Irteza Karim is a great Fiction writer and literary parson. There are many books are published in India and Pakistan. He is a senior professor and ex dean of Delhi University, Delhi. He is ex director of National Kaumi Kauncil baraye Farog Urdu Zaban Delhi. Now he is a great writer of Urdu Fiction.

پروفیسر ارتضیٰ کریم اردو تنقید نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''زندگی کی طرح ادب میں بھی مختلف دبستان کی بنیاد پڑتی ہے۔اس نہج اور فکر پر پھر پسند اور ناپسند، اچھے اور بُرے اور رد و قبول کا عمل بھی منحصر ہوتا ہے جو تنقید کی پہلی منزل ہے۔ادبی تنقید بھی اس کے زیر اثر مختلف دبستانوں میں تقسیم ہوگئی۔چنانچہ تذکروں سے لے کر تادم تحریر''اردو تنقید'' اپنے معیار اور مزاج کے اعتبار سے کئی رنگ میں نظر آتی ہے۔۔۔۔ہر تنقیدی اسکول کا انداز نقد جدا ہے۔کوئی ادب کے جمالیاتی پہلو پر زور دیتا ہے تو کوئی نفسیاتی، کوئی

تاثرات قلم بند کرتا ہے تو کوئی تقابل پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ضرورت اس نوع تنقید کی تھی جو ادب اور فن پارے کا بحیثیت مجموعی تجزیہ پیش کرے۔ جو نئے فن اقدار کو بھی ملحوظ خاطر رکھے۔''

(موضوعات،ص63،ارتضیٰ کریم)

فن پارے کی تفہیم وتعبیر کا غیر معمولی درک رکھنے والے پروفیسر ارتضیٰ کریم اردو ادب کے ایک سنجیدہ، کشادہ ذہن اور وسیع النظر محقق و ناقد ہیں۔ وہ عصر حاضر کے ان ناقدین میں شامل ہیں جنہیں کسی فن پارے کو پرکھنے کا ہنر آتا ہے۔ادب میں پیدا ہونے والی خامی کا احساس کرنے والے سنجیدہ ناقد ہیں۔ ارتضیٰ کریم نے جس دیدہ ریزی وتفکرانہ انداز نقد سے ادبی تنقید میں مقام حاصل کیا،اس سے ان کے تہہ دار تنقیدی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

ادب میں تنقید کا ہونا لازم ہے۔ اگر ادب میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی نہ ہو تو وہ ادب ادھورا تسلیم کیا جاتا ہے۔ ارتضیٰ کریم نے ادبی علمی اور تحقیقی کارنامے انجام دئے ہیں۔ ویسے تو ان کا ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع ہوا لیکن کچھ دن بعد انہوں نے اپنی توجہ تحقیق،تنقید و تالیف کی جانب مرکوز کردی۔ وہ ایسے تجربہ کار ہیں جنہوں نے شاعری کے علاوہ فکشن تنقید میں سینکڑوں سالہ فکشن پر تنقیدی نظر ثانی کی ہے۔ وہ غیر جانب دارانہ انداز میں گہری نظر وفکر سے کسی فن پارہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ متعدد رسائل،اخبارات، کتابیات سے ان کے تنقیدی ذہنی توازن کا پتہ چلتا ہے۔ ارتضیٰ کریم کی غیر جانب دارانہ نظروں کے تیر قارئین کی جانب رُخ کرتے ہیں تو قارئین کی بھی چابکدست نگاہ پروفیسر ارتضیٰ کریم کی جانب متوجہ ہوجاتی ہے کیونکہ قارئین بخوبی جانتے ہیں کہ موصوف کے اندر پائی جانے والی فکر،تنقید کی جانچ پرکھ متن کی چھپی پرتوں سے پردہ اٹھاتی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کا نام تنقیدی وتحقیقی کارناموں کی وجہ سے عملی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ انکی تنقیدی بصیرت کے تعلق سے وہاب اشرفی کا یہ اقتباس دیکھئے:

''موصوف نے اردو فکشن کی تنقید میں اس کی چار سو سالہ تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کی سعی متحسن کی ہے۔ یہ ایک اہم مطالعہ ہے۔ جو نوجوان ترقی پسند نقاد کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔''عجائب القصص'' پر بھی انہوں نے ایک تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے نقطۂ نظر سے یہ ایک ادبی اہمیت اور ثمر آفریں کوشش ہے۔موصوف کے مقالات ان کے ذہنی روش کا پتہ دیتے

ہیں۔''

(تاریخ ادب اردو جلد دوم، وہاب اشرفی، ص، 1148 ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس، دہلی)

پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ادبی کارنامے بہت ہیں۔ انہوں نے اردو فکشن کی تنقید ،ترتیب اور تدوین میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کے ادبی تنقیدی کارناموں کا اندازہ تو انکی بہت سی تالیفات، تصانیف اور ادبی مضامین سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے مگر ان کی کئی اہم کتب مثلاً ''اردو فکشن کی تنقید'' مابعد جدیدیت اور پریم چند، انتظار حسین ایک دبستان، موضوعات وغیرہ کے مطالعہ سے پروفیسر ارتضیٰ کریم کے تنقیدی نظریات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب کی کئی اصناف مثلاً داستان، ناول، افسانہ، خاص طور پر فکشن کے میدان کو وسیع کرتے ہوئے انہوں نے ادبی تنقید کو استحکام عطا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور نقاد بھی، صاحب طرز بھی ہیں اور اہم شخصیت کے مالک بھی۔ وہ کئی ایسی تنقیدی کتابوں کے مصنف ہیں جو اردو ادب میں صقیل حیثیت کی حامل ہیں۔ ''اردو فکشن کی تنقید''، ''جدید تنقید کا منظر نامہ''، ''قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ''، ''انتظار حسین ایک دبستان''، ''عجائب القصص: ایک مطالعہ'' وغیرہ نے موصوف کو ادبی تنقید میں ایک معتبر اور مستند تنقید نگاری کی پہچان عطا کی ہے۔ ان تصانیف کے علاوہ بھی موصوف کی کئی اہم کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔ جیسے بہار کا اردو ادب (1986ء) عجائب القصص: ایک تنقیدی مطالعہ (1987ء) ترقی پسند ادب (1988ء) موضوعات (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) (1989ء) قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ (1992ء) اردو فکشن کی تنقید (1996ء) جدید تنقید کا منظر نامہ (2003ء) انتظار حسین ایک دبستان، مابعد جدیدیت اور پریم چند (2006ء) کلیات سہیل عظیم آبادی، نظام خطبات، کلیات خواجہ احمد عباس اور جوگندر پال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ بھی ارتضیٰ کریم کے بلند پایہ علمی ادبی تحقیقی و تنقیدی مقالات و مضامین معتبر رسائل، اخبارات وغیرہ میں سائع ہو چکے ہیں۔ بہت سے تحقیقی پرچے شائع ہو کر قارئین کو مستفید کر رہے ہیں۔ معیار تنقید اور ذوقِ تحقیق کی توضیح کے بعد جب پروفیسر ارتضیٰ کریم کی علمی ادبی تحریروں پر نظریں بچھاتے ہیں تو آپ کے کلام میں تنقیدی انفرادیت اور تحقیق کا حسن نظر آتا ہے۔

''موضوعات'' پروفیسر ارتضیٰ کریم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں مصنف نے بارہ تنقیدی مضامین ''میرے بھی صنم خانے: ایک مطالعہ''، ''طلسم ہوش ربا اور

داستان کی تنقید‘‘،’’عجائب القصص‘‘اور’’باغ و بہار: ترقی پسند تنقید اور اردو فکشن‘‘،’’ترقی پسند تحریک اور بہار کا اردو افسانہ‘‘،’’اردو مثنویوں کی کہانیاں‘‘خواجہ احمد عباس: بلاعنوان‘‘،’’احمد ندیم قاسمی‘‘،’’فیض کا تنقیدی رویہ‘‘،’’ترقی پسند تحریک کی وراثت‘‘،’’حسرت موہانی: فکر اور فن‘‘، ’’نظیر اکبر آبادی اور اردو غزل‘‘شامل ہیں ۔ان مضامین میں داستان ، ناول ، افسانوں اور شاعری پر تنقیدی بحث کی گئی ہے۔خود صاحب کتاب پروفیسر ارتضیٰ کریم کو یہ احساس تھا کہ داستان، ناول اور افسانوں پر قارئین کو تنقیدی تحریریں مشکل سے ملتی ہیں۔اگر افسانوی ادب پر تاریخی و تنقیدی نظر ڈالی جائے تو علی عباس حسینی جیسے ادبا کی ادیب سے نظریں چار کرنی پڑتی ہیں۔ابتدائی افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں پر بھی تنقیدی کتب مشکل سے نظر آتی ہیں۔لیکن قارئین اور ادب کے اسکالرس کو دیکھتے ہوئے ارتضیٰ کریم نے یہ کتاب تحریر کی۔جس میں فکشن کی تنقید تاریخ اور معتبر ادباء،شعراء پر تنقیدی مضامین تحریر کئے گئے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کا یہ اقتباس دیکھئے:

> ’’کیا اردو ناول اور اردو افسانہ کی کوئی تنقیدی اور تہذیبی تاریخ لکھی گئی ؟ آج بھی اردو ناول کی تاریخ و تنقید کے لئے ہمیں علی عباس حسینی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہمارے صف اول کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں پر بھی مستقل تنقیدی کتابیں نہیں ملتیں ۔جس سے ادب کے طالب علم کو ان افسانہ نگاروں کے متعلق مکمل سوانحی تنقیدی اور تحقیقی معلومات حاصل ہو سکے۔‘‘

(موضوعات، پروفیسر ارتضیٰ کریم،ص،7 زلالہ پبلی کیشنز دہلی 1989ء)

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے تنقید کے موضوعات پر’’اردو فکشن کی تنقید‘‘،’’موضوعات‘‘ ’’مابعد جدیدیت اور پریم چند‘‘وغیرہ لکھی ہیں۔ان کی تنقیدی تصانیف’’اردو فکشن کی تنقید‘‘اور ’’قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ‘‘میں اردو ناول کی تنقید پر لکھے گئے مقالات ،مضامین اور تنقیدی تحریریں ایسی منفرد خصوصیات رکھتی ہیں جن کے تنقیدی تصورات سے قارئین اور اسکالر بین الاقوامی سطح پر مستفید ہوتے ہیں۔’’قرۃ العین حیدر : ایک مطالعہ‘‘ موصوف کی ایک ایسی اہم کتاب ہے جس میں قرۃ العین حیدر کے ناولوں ، افسانوں اور ان کے فن پر تہہ دار گفتگو کی گئی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے قرۃ العین حیدر کے ناول’’میرے بھی صنم خانے‘‘پر ایک اہم تنقیدی مضمون تحریر کر کے ناول نگار کے شعور کی رو کی ٹکنیک ،عینی کے تجربات ، وقت کا المیاتی کرشمہ کی

خوبصورت عکاسی کی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس کو ارتضیٰ کریم ایک ممتاز ناقد تسلیم کرتے ہیں۔ عینی آپا کے ناولوں اور افسانوں کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''قرۃ العین حیدر کے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے شعور کی رو کی ٹکنیک پر اظہار خیال کیا ہے۔ جس سے نئی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اس میں مکمل طور پر شعور کی رو کی تکنیک کو تسلیم نہیں کرتے، اور اسے دراصل عینی آپا کا تجربہ کہتے ہیں۔''

''میرے بھی صنم خانے: ایک مطالعہ'' کتاب ''موضوعات'' کا پہلا مضمون ہے۔ اس مضمون میں قرۃ العین حیدر کے پہلے ناول ''میرے بھی صنم خانے (1949ء) کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس ناول کا تنقیدی مطالعہ اس انداز سے تحریر کیا ہے کہ اگر اس ناول کا مطالعہ بھی نہ کیا جائے اور صرف ناول پر اس مضمون کو ہی پڑھ لیا جائے تو اس تنقیدی مضمون کا مطالعہ کرنے کے بعد قرۃ العین حیدر کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں پیش کی گئی ہندوستانی مشترکہ تہذیب، تاریخ اور وقت کے کرشمے کو بخوبی سمجھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ موصوف اردو فکشن اور فکشن تنقید سے بخوبی واقف ہیں وہ فکشن کو فنی تنقید اور موضوعاتی طور پر سمجھتے اور سمجھاتے ہیں اور یہ ہی نہیں وہ فکشن میں رونما ہونے والی تبدیلیوں و پے چیدگیوں کو بھی بخوبی سمجھتے اور ان سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 1992ء میں ''قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ'' کتاب مرتب کی۔ جس میں ارتضیٰ کریم نے قرۃ العین حیدر کے ناولوں، افسانوں، ناولٹ اور ان کے رموز فن پر اہم ناقدین کے پر مغز تنقیدی مضامین شامل کئے ہیں۔ اس کتاب میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کا مضمون ''میرے بھی صنم خانے'' صفحہ پانچ سو اکسٹھ پر تحریر ہے۔ اس تنقیدی و تحقیقی مضمون کے علاوہ ادباء و ناقدین میں پروفیسر قمر رئیس، ابوالکلام قاسمی، احمد ندیم قاسمی، وارث علی، عبدالمغنی، مجتبیٰ حسین، راہی معصوم رضا، وحید اختر شمیم حنفی، یوسف سرمست، محمود ہاشمی وغیرہ نے گراں قدر مضامین تحریر کئے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم حقیقت میں قمر رئیس کی مانند حقیقت کے قائل ہیں۔

ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کے تنقیدی جائزہ میں قرۃ العین حیدر کا عہد، خاندان، مشترکہ تہذیب کی قدریں، زمیندارانہ نظام کا ظلم وستم، وقت کا کرشمہ اپنے سے بچھڑنے کا المیہ اور ملک میں پھیلے تہذیبی زوال کے حالات کو منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بات انسانی نفسیات کی ہو یا داخلی و خارجی طور پر وقت کے کرشمائی جلووں کی، تہذیبی قدروں کی پامالی وقت کے ساتھ

ساتھ سفر کرتی ہے۔خوشی ہو یا غم وقت کسی بادشاہ یا فقیر کی قدر دانی، قربانی یا وفاداری کو نہیں دیکھتا۔اس کو صرف بدلنا آتا ہے ٹھہرنا نہیں۔کبھی اس کی رفتار تیز ہوتی ہے کبھی دھیمی رفتار سے انسانی کیفیت کو تبدیل کر دیتا ہے۔''بیسویں صدی میں اردو ناول'' کے صفحہ نمبر چار سو بہتر پر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''وقت انسانی نفسیات میں الگ نوعیت رکھتا ہے۔ وقت کا داخلی احساس خارجی وقت یا گھڑی کے وقت سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔نفسیاتی یا داخلی طور پر وقت کبھی بے حد آہستہ گزرتا ہے اور منٹ بھی برس معلوم ہوتے ہیں اور کبھی برس بھی منٹوں میں گزرتے نظر آتے ہیں۔''

اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ قرۃ العین حیدر کے ناول تہذیبی زوال کو پیش کرتے نظر آتے ہیں۔مشترکہ تہذیب و تاریخ کی داستان کے نقوش اگر دیکھنے ہوں تو عینی آپا کے ناولوں کا مطالعہ ہمیں تاریخ کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہوا نظر آتا ہے۔اس تاریخ میں قرۃ العین حیدر نے ناولوں کے کرداروں کے ذریعہ ملک میں انقلابات کی سچی تصاویر دکھائی ہیں۔ مسلمانوں کی مٹتی تہذیب، شان و شوکت کی مسمار ہوتی ہوئی تہذیبی قدریں، مال اسباب کے ساتھ ساتھ خواتین پر ظلم و ستم کی سچی تصاویر، آزادی ملنے کے بعد تعصّبات کے اُمڑتے بادل وغیرہ کو صاف طور پر دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنی کتاب ''قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ'' میں کتنی سچی بات لکھی ہے۔''دراصل یہ ناول ایک عہد کی تاریخ ہے۔تہذیب کا ایک مرقع ہے۔ رخشندہ کا تعلق غفران منزل سے ہے۔غفران منزل ایک زمانے میں اپنی تہذیب اور تمدن کے لئے مشہور تھا۔مگر زمانے کے تغیرات اور انقلابات نے غفران منزل کو بھی متاثر کیا تھا۔غفران منزل کے استعارے میں ناول نگار نے مسلمانوں کی اس تہذیب کو پیش کیا ہے۔جس میں جاہ و جلال، شوکت و شان اور خودی و خوداری تھی۔ جہاں زمیندارانہ نظام تھا۔جن مسلمانوں نے ملک کی آزادی کی خاطر جان دی تھی مال اسباب عزت دولت گنوائی تھی مگر اس قربانی کے نتیجہ میں انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ یہ نظام برباد ہو گیا۔آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی شان و شوکت کے ستارے ڈوب گئے۔ان تمام شکست و ریخت کو خوبصورتی اور فنکاری سے ناول میں پیش کیا گیا ہے۔''

کتاب موضوعات کا دوسرا مضمون ''طلسم ہوشربا اور داستان کی تنقید'' ہے۔جس میں پروفیسر ارتضیٰ نے داستان ''طلسم ہوشرُبا'' کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے اس کے تنقیدی

خدوخال کومنفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ دراصل داستان کا وجود انسانی وجود کے ساتھ ہوا۔ جب سے انسان نے اس روئے زمین پر قدم رکھا ہے تب ہی سے داستان کے بال و پر میں اضافہ ہونے لگا۔ جیسے جیسے انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ گھومتا پھرتا، روزی روٹی کمانے میں وقت صرف کرتا، شام کو تھکا ہارا گھر میں لوٹتا اور تمام تر روداد اپنے گھر والوں کو سناتا، اسی قصہ کہانی اور صبح سے شام تک کے گشت کو داستان کا نام دیا گیا۔ کبھی دن بھر کی پریشانیوں، مصیبتوں کا ذکر کرتا کبھی راجہ، مہاراجہ، رانی، مہارانی کے قصے سنا کر گھر والوں اور باہر والوں کے دلوں کو بہلاتا، اسی طرح اس روداد کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا جانے لگا۔ یہ قصے کہانیاں لوگوں کو ذہنی تسکین عطا کرتی تھیں۔ لوگوں کے دلوں کو بہلانے کا اور دلچسپی پیدا کرنے کا یہ ایک خاص مشغلہ سمجھا جانے لگا۔ یہ قصے کہانیاں لوگوں کو ذہنی تسکین عطا کرتی تھیں۔ لوگوں کے دلوں کو بہلانے اور دلچسپی پیدا کرنے کا ایک نیا اور منفرد طریقہ سمجھا جانے لگا۔

''اردو فکشن کی تنقید'' پروفیسر ارتضیٰ کریم کی ایسی اہم تصنیف ہے جسے فکشن تنقید میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ تنقیدی اور دستاویزی کارنامہ 1996ء میں منظر عام پر آیا، جسے تخلیق کار پبلی شرز نے شائع کے۔ اس تخلیقی اور تنقیدی تصنیف کی اہمیت ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ہے جسے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ ایسی مقبولیت بہت کم کتابوں کے حصہ میں آتی ہے۔ اس تصنیف میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صرف چھ باب میں فکشن تنقید کے سرمائے کو چھ سو چھیالیس صفحات میں تحریر کیا ہے۔ پہلا مضمون ''اردو فکشن کی تنقید: آغاز وارتقاء'' ہے دوسرا مضمون ''تمثیل پر تنقیدی گفتگو'' سے تعلق رکھتا ہے۔ تیسرا مضمون ''داستان پر تنقیدی سرمایہ'' ہے اس تیسرے مضمون میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے داستان پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، رانی کیتکی کی کہانی، طلسم ہوشربا، عجائب القصص وغیرہ پر اہم گفتگو کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور، میر امّن، انشاءاللہ خاں انشاء، ملا وجہی وغیرہ کی ادبی خدمات، فنی تکنیک اور ان کے داستانوی فکر وفن کو منفرد انداز میں پیش کر کے ارتضیٰ کریم نے بطور اہم ناقد اپنی شناخت قائم کی ہے اور داستانوی ماحول وارد کر کے معاشرتی تقاضوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے فکر وفن اور تنقیدی بصیرت کا اظہار داستانوی رنگ وآہنگ میں کیا ہے اور داستان طلسم ہوشربا کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

کتاب ''اردو فکشن کی تنقید'' کا چوتھا باب ناول پر تنقیدی سرمایہ ہے۔ اور پانچواں مضمون افسانہ پر تنقیدی سرمایہ ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اس مضمون میں منشی پریم چند

کی افسانہ نگاری سے نئے افسانہ نگار عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدیؔ، جوگندر پال، قرۃ العین حیدر، منٹو، انتظار حسین وغیرہ کی کہانیوں پر تنقیدی گفتگو کی ہے دراصل انتظار حسین ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو اپنا رشتہ ماضی سے جوڑے رکھتے ہیں ان کے افسانوں میں داستانی فضا، ماضی کی روایت، علامتی اسلوب کو ایک مستقبل فن کی حیثیت دی ہے۔ لوک کتھاؤں، اسلامی روایات، اخلاقی اور رومانی زوال کی تصاویر پر ملتی ہیں۔ افسانہ، آخری آدمی، زرد کتا، شہر افسوس وغیرہ ان کے اہم افسانے ہیں۔ ان تمام افسانوں اور انتظار حسین کے تخلیقی رویوں کو پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنی کتاب ''انتظار حسین: ایک دبستان'' میں ناقدانہ بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی مرتب کردہ کتاب ''انتظار حسین: ایک دبستان'' میں انتظار حسین کی کہانیوں، تخلیقی رویوں، اور تہذیبی قدروں کو فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کی کہانیاں تہذیبی قدروں کے ساتھ ساتھ سیاسی نظریات کے پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتی ہیں اور یہ تنقیدی، تہذیبی اور سیاسی پہلو ایسے ہیں جن کو ملک ہندوستان کی تقسیم سے جدا نہیں کیا جا سکتا اسی لئے پروفیسر ارتضیٰ کریم کی کتاب ''انتظار حسین: ایک دبستان'' کے صفحہ نمبر چھیالیس پر رام لعل لکھتے ہیں کہ ''انتظار حسین کی کہانیاں تہذیبی بازیافت اور سیاسی و نظریاتی بیانات سے بھی جڑی ہوئی ہیں۔ جیسے ملک کی تقسیم سے الگ کر کے دیکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔'' اگر ہم عہد حاضر کے ممتاز ناقدین اور ان کی تخلیقات پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلے گا کہ ان ناقدین ادب میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کی ادبی تنقید کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی اکثر تصانیف کا تعلق تنقید سے ہے۔ تنقیدی و تحقیقی مقالوں پر مشتمل ان کی کئی تخلیقات قارئین کو متاثر کر چکی ہیں۔ اسی سلسلے کی اہم کڑی ''اردو فکشن کی تنقید'' ہے۔ جس میں آپ نے ناول نگاروں، افسانہ نگاروں کی اہم تخلیقات پر تنقیدی اور تفصیلی گفتگو کے میدان کو وسیع کیا ہے۔ انہی فکشن نگاروں میں انتظار حسین کو بھی قدر کی نگاہ سے پڑھا جاتا ہے۔ اسی لئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ''انتظار حسین: ایک دبستان'' کے نام سے ایک ایسی کتاب مرتب کی جس میں انتظار حسین کے تخلیقی کارناموں، تنقیدی تحریروں، یادوں باتوں کو قارئین کے روبرو پیش کرنے کا منفرد کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔ عہد حاضر کے ممتاز ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ بھی انتظار حسین کی یادوں، باتوں اور مسرتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''انتظار حسین کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے سارے وجود کو یعنی لاشعور حافظے،

عقیدے اور تجربے و مشاہدے کو تخلیقی نقطے پر مرتکز کر سکتے ہیں۔۔۔۔وہ ان یادوں اور خوابوں کو واپس لانے کی سعی کرتے ہیں جو ماضی میں انسان کی مسرتوں اور اس کی خوشیوں میں بسے ہوئے تھے۔اور عہد حاضر کی یلغار میں یکا یک غائب ہو گئے۔وہ ان یادوں کو کھیل کے میدانوں سے بھاگے ہوئے بچوں کی طرح پکڑ پکڑ کر لاتے ہیں۔اور سب جمع ہو کر دھما چوکڑی مچاتے ہیں۔انتظار حسین کہتے ہیں کہ انسان چونکہ یادیں رکھتا ہے اس لئے ہے۔''

(انتظار حسین: ایک دبستان، انتظار حسین کا فن، ص155 گوپی چند نارنگ 1996ء)

کتاب ''اردو فکشن کی تنقید'' کا اہم مضمون ''اردو فکشن کی تنقید'' ہے جس میں داستان، ناول، افسانوں کے تعلق سے فکشن کے ناقدین کے ذریعہ تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور اس کتاب کے آخر میں ڈاکٹر محمد حسن نے ''حرف آخر'' کے نام سے بھی ایک باب تحریر کیا ہے۔جس میں تنقیدی تحریروں پر نظر ثانی کرتے ہوئے ارتضیٰ کریم کی اس تنقیدی کاوش کو اولیت کا شرف قرار دیا ہے۔کتاب کی اہمیت و مقبولیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ارتضیٰ کریم کی وسیع النظری کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تنقیدی نگاہ اور ان کی کتاب ''اردو فکشن کی تنقید'' کا احاطہ تنقید پر تنقید کا چلن تنقیدی صلاحیت کو پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

''آپ نے بڑا اچھا کیا کہ اس بنجر زمین میں پھول کھلانے کے لئے قدم بڑھایا اور قلم اٹھایا اور مختلف راستوں کو مربوط اور منضبط ڈھنگ سے جانچنے اور پرکھنے کا بیڑا اُٹھایا۔

یوں تو بقول اقبالؔ: ؎

لکھی جائیں گئی کتاب دل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

مگر آپ کی اس کاوش کو اولیت کا شرف تو حاصل رہے گا۔یہی بہت ہے۔ آپ کو اولیت کے پھول اور گجرے بھی ملیں گے اور اس کی کوتاہیوں کے کانٹے بھی حصے میں آئیں گے۔مجھے بڑی مسرت ہے کہ اب اردو میں تنقید پر تنقید کا چلن شروع ہو رہا ہے اور آپ نے اس دور کے آغاز کا کام سنبھالا ہے۔اور اس کے خطرات کو اپنایا ہے۔یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی جوکھم کا بھی ہے کہ اس میں نظر بھی چاہیے اور وسیع النظری بھی۔ذرا نظر میں دھند آئی

یا دل میں تنگی نے ڈیرا جمایا تو سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے اور آپ
اس ''پورا تولنے اور سچا بولنے'' کے عمل میں کامیاب رہے ہیں۔''

(اردو فکشن کی تنقید ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ص، 631 تخلیق کار پبلی شرز دہلی 1996ء)

ممتاز ناقد کلیم الدین احمد اور گیان چند جین نے بھی داستان کی تنقید پر عمدہ تحریریں رقم کی ہیں۔ کلیم الدین احمد داستان کو دلچسپی کا سامان تسلیم کرتے ہوئے اچھا ادب بتاتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے تعلق سے خود پروفیسر ارتضیٰ کریم اپنی کتاب ''اردو فکشن کی تنقید'' میں لکھتے ہیں کہ 'کلیم الدین احمد نہ صرف یہ کہ داستان میں دلچسپی کو ضروری بتاتے ہیں بلکہ اچھے ادب کے لئے اسے اہم بھی قرار دیتے ہیں۔ وہ کہانیوں کے اچھے یا بُرے کی پہچان دلچسپی کی بنیاد پر رکھتے ہیں'' کلیم الدین احمد اور گیان چند جین نے داستان کی خوبیوں اور خامیوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور قارئین کو اس جانب توجہ دلائی کہ داستانیں یوں ہی وجود میں نہیں آئیں بلکہ ان میں شعور کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ عوام کی دلچسپی اور انسانی تہذیبی قدریں بھی ہوتی ہیں۔ کلیم الدین احمد داستان کو غالب کے مانند دل بہلانے کا فن قرار دیتے ہیں۔ داستان کی فنی خصوصیات اور خامیوں کے تعلق سے کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''داستان کیا ہے'' میں اہم داستانوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے جس میں داستان طلسم ہوشربا، بوستان خیال اور منظوم داستانیں وغیرہ شامل ہیں۔ طلسم ہوشربا کے تعلق سے ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے بھی اپنی تحقیقی وتنقیدی کتاب ''طلسم ہوشربا: ایک مطالعہ'' میں ہندوستانی زندگی کی خوبصورت تصویر پیش کی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین بھی داستان میں رومانس کو اہمیت دیتے نظر آتے ہیں اور یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ داستانیں عشق وعشرت کے ماحول کی دین ہیں۔ انسانی تہذیبی قدریں انسانی زندگی کی حرکت و عمل سے معمور ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے بھی داستان ''طلسم ہوشربا'' کے تعلق سے ممتاز ناقدین وقار عظیم، ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی ناقدانہ بصیرت کو خوبصورت انداز میں اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں:

''کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب میں طلسم ہوشربا کا خاصا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور چھ الگ الگ حصوں میں اس کی فنی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ گیان چند جین نے بھی اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ جس میں تحقیق وتنقید کا امتزاج ہے۔ وقار عظیم طلسم ہوشربا کے بارے میں خاموش ہیں۔ ان تمام مختصر اور بڑی تحریروں کے بعد ہمیں ڈاکٹر راہی معصوم رضا کی تصنیف ''طلسم

ہوشربا: ایک مطالعہ'' اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ یہ تحقیقی اور تنقیدی کاوش کئی پہلوؤں سے داستان کی تنقید کے سرمایے میں تادم تحریر منفرد اور یکتا نظر آتی ہے۔''

(موضوعات، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ص، 37 زلالہ پبلی کیشنز دہلی 1989ء)

پروفیسر ارتضیٰ کریم کا ناقدانہ اسلوب جب قاری کے سامنے آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کے پیرو مرشد ہیں۔ اپنی تحریروں میں انسانی سماج کی بات کرتے ہیں۔ ہندوستان میں رہنے والی خواتین کے مسائل سے واقف ہیں۔ عوامی اور ازدواجی زندگی میں پیدا ہونے والے المیاتی ماحول سے واقفیت رکھتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستانی خواتین صرف ہندوستانی ہیں نا کہ ہندو یا مسلمان۔ وہ صرف اپنے ملک ہندوستان کی خواتین ہیں جو پردہ بھی کرتی ہیں اور ہندوستان میں رہنے والے ملک اور ملک کے باشندوں سے عشق بھی فرماتی ہیں ۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں:

''اس انسائی سماج میں نسبی برتری کا احساس بھی ہوتا ہے اور ازدواجی زندگی کی کھٹ پٹ بھی، عشق بھی ہوتا ہے اور طلاق بھی۔ عورتیں پردہ بھی کرتی ہیں ۔ اپنی رائے میں کلیم الدین احمد کی رائے شامل کرتے ہوئے کہا ہے کہ طلسم کی عورتیں اسلامی نہیں ہندوستانی پردہ کرتی ہیں اور حسن عسکری اسی بنیاد پر اور شہزادیوں کی بے باکی پر طلسم کی عورتوں کو طوائف کہتے ہیں۔''

(کتاب موضوعات، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ص 47 زلالہ پبلی کیشنز دہلی 1989ء)

دراصل داستان کی ظاہری خصوصیات کے ساتھ ساتھ پروفیسر ارتضیٰ کریم فکشن کی معنویت پر روشنی ڈالتے ہوئے قدیم عہد کی داستانوں میں خواتین کی نسائی مشکلات کو بھی بیان کرتے ہیں ۔ داستان کے تعلق سے ارتضیٰ کریم بلند خوانی، سادگی و تنقیدی اصطلاحات کی صراحت کرتے نظر آتے ہیں۔ موصوف نے بار ہا فورٹ ولیم کالج اور اس میں تصنیف یا تالیف کی گئیں داستانوں پر اپنی توجہ مبذول کی ہے اور داستانوں و فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات میں فکشن تنقید کو تلاش کر کے اپنے تخلیقی تنقیدی آئینہ خانے کو روشن کرنے میں مشرق و مغرب سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ مغرب میں فکشن تنقید پر تہد دار گفتگو کی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم اپنی کتاب ''اردو فکشن کی تنقید'' کے صفحہ نمبر تیرہ پر لکھتے ہیں۔ ''اگر چہ مغرب میں فکشن کی روایت بہت پرانی ہے اور شروع میں وہاں بھی فکشن کے نام پر Fairy Tales Romances

اور Allegories وغیرہ بھی لکھے گئے لیکن اردو ہی کی طرح انگریزی کی بھی اصناف کو سنجیدہ ادب سے ان معنوں میں خارج کر دیا گیا کہ یہاں انسان کی ارضی زندگی کی کوئی تصویر نہیں بنتی۔ ان کی غرض حقیقت نگاری نہیں بلکہ حیرت انگیریزی ہوتی ہے۔ان کا مقصد تفریح وتفنن ہے نہ کہ مسائل زندگی کا بیان۔''

ارتضٰی کریم کی کتاب ''موضوعات'' کا تیسرا مضمون ''عجائب القصص اور باغ و بہار'' ہے۔اس مضمون میں داستانوں کے تنقیدی مطالعہ کے ساتھ ساتھ '' باغ و بہار'' اور ''عجائب القصص'' پر تہدار تنقیدی تفکرات و تجربات کے نئے چراغ روشن کئے گئے ہیں۔ارتضٰی کریم کے اس مضمون کا مطالعہ کرنے پر محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے دونوں داستانوں کے ساتھ ساتھ دیگر داستانوں کے دلائل کو بھی فکر وشعور کے ساتھ پیش کیا ہے۔کلیم الدین احمد نے 'باغ و بہار' پر تنقیدی روشنی تفصیل سے ڈالی ہے۔اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ باغ و بہار میں حسن وسلاست کے ساتھ ساتھ تہذیبی وراثت کو بھی مضبوط کرنے والی قدریں موجود ہیں۔اس داستان میں زور بیان کی خوبصورتی ہے۔کلیم الدین احمد کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس داستان کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اس داستان کی زبان اور طرز بیان دیگر داستانوں کے مقابلے میں مختلف مگر سادہ اور سلیس ہے۔معاشرت کی جلوہ گری خوب سے خوب تر ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی میر امّن کی داستان ''باغ و بہار'' اہم اور معروف ہے۔ باغ و بہار کا انداز نہایت سلیس سادہ اور عام فہم ہے۔جہاں بھی میر امّن کا نام آتا ہے اسی وقت '' باغ و بہار'' کو بھی یاد کیا جاتا ہے۔دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔اور جڑیں بھی کیوں نہیں؟ میر امّن نے اس داستان کو سادگی پرکاری کا نیا لباس جو عطا کیا تھا۔سادہ اور سلیس اندازِ بیان کی ہی وجہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں یہ داستان کئی بار شائع ہوئی اور عوام میں مقبولیت حاصل کرتی رہی۔مگر ''باغ و بہار'' کے مقابلہ میں '' عجائب القصص'' کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو ''باغ و بہار'' کے حصّہ میں آئی، کیونکہ ''عجائب القصص'' میں صرف دربار کی رونقیں، بادشاہ کا دربار اور سلطنت وغیرہ کا ہی ذکر ہے۔ پروفیسر ارتضٰی کریم نے کتنی تہداری اور چابکدستی سے تنقیدی نگاہ کے ساتھ اس کے اوصاف بیان کئے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''سب سے بڑی چیز جو ''عجائب القصص'' کو اردو کی دوسری داستانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کی زبان اور اسلوب ہے۔راقم الحروف نے اپنی کتاب ''عجائب القصص: تنقیدی مطالعہ'' میں اس عہد کی بعض اہم نثری تصانیف کے اسلوب کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ''

عجائب القصص'' کی نثر نے ''باغ و بہار'' کی نثر کے لئے راہیں ہموار کیں۔ بلکہ میر امّن نے ''عجائب القصص'' کے چراغ سے اپنا چراغ روشن کیا۔'' اس جانب بھی ہماری توجہ جانی چاہیے کہ زیادہ تر ناقدین ادب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ''باغ و بہار'' کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو کسی دوسری داستان کے حصّہ میں نہ آسکی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی روبرو ہونا چاہیے کہ داستان ''باغ و بہار'' کی مقبولیت کا راستہ داستان ''عجائب القصص'' نے ہی تعمیر کیا تھا۔ ارتضٰی کریم کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کیجئے:

> ''باغ و بہار کے پس پشت فورٹ ولیم کالج تھا۔ اور اس کالج کے خاص مقاصد تھے۔ جن کے طفیل یہ بار بار چھپتی اور قبول عام حاصل کرتی رہی۔ اس کے برعکس عجائب القصص ایک عرصۂ دراز تک گمنامی میں پڑی رہی۔ چونکہ اس کا مصنف ایک ایسا بادشاہ تھا جو آخر دم تک اپنے مقدر سے لڑتا رہا۔ نتیجہ میں اس کا شعر و ادب پورے طور پر عوام کے سامنے نہ آسکا۔''

(موضوعات، ڈاکٹر ارتضٰی کریم، ص، 52، زلالہ پبلی کیشنز، دہلی 1989ء)

پروفیسر ارتضٰی کریم نے کلیم الدین احمد کی داستان کی تنقید کے حوالے سے ان کے افکار و اسلوب سے معقول گفتگو کی ہے۔ انہوں نے جس تہداری سے کلیم الدین احمد کا مطالعہ کیا ہے وہ حقیقتاً لائق تحسین ہے۔ کلیم الدین احمد کی داستانوی تکنیک اور فن کے تعلق سے بخوبی بحث کی ہے۔ ارتضٰی کریم اپنی کتاب ''اردو فکشن کی تنقید'' میں لکھتے ہیں: ''کلیم الدین احمد کے نزدیک داستان گو تخیل کی مدد سے داستان کو دلچسپ اور گرما گرم بنا سکتا ہے۔ خام مواد خواہ جیسا ہو اگر اس میں تخیل نے زندگی ڈال دی ہے تو داستان میں لطف پیدا ہو جائے گا۔'' اس کے علاوہ ارتضٰی کریم داستان ''باغ و بہار'' کو اول درجہ کی داستان تسلیم کرتے ہوئے اس کی فنی خصوصیات بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ داستان ''باغ و بہار'' سے قبل ''عجائب القصص'' لکھی تو جا چکی تھی لیکن مقبولیت حاصل کرنے میں قاصر رہی اور یہ بھی حق ہے کہ اس داستان میں سادہ اور سلیس زبان کی موجودگی نے معاشرتی زندگی کی عکاسی بحسن و خوبی سے کی اور ''عجائب القصص'' کی سادہ نثر کے نمونے کے اثرات باغ و بہار میں آکر رم گئے اور باغ و بہار میں چمکنے لگے۔ اس بات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سادہ زبان اور سلیس اسلوب کی بنا پر ہی باغ و بہار کو زینت بخشی گئی۔ لیکن اس خصوصیت سے ''عجائب القصص'' محروم رہی۔ اس طرح کی تنگ دلی نے ''عجائب القصص'' کو مقبولیت عام سے محروم کر دیا۔ بقول پروفیسر ارتضٰی کریم: ''جب باغ و بہار سے دس

گیارہ سال قبل کی ایک نثری کاوش سامنے آچکی ہے اور جس کی نثر باغ و بہار سے کسی طرح بھی کم سلیس اور سادہ نہیں تو میر امّن کی نثر کو اولیت کا درجہ دینا زیادہ مناسب نہیں بلکہ ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ اب وہ نثر جس نے میر امّن کو ایسی سلیس نثر لکھنے کی ترغیب دی، وہ عجائب القصص ہی ہے۔ اس لئے ''عجائب القصص'' کی نثر کو ہی سادگی اور سلاست کے لحاظ سے سرفہرست رکھنا چاہیے۔ اسی لئے پروفیسر قمر رئیس تسلیم کرتے ہیں کہ ''باغ و بہار'' کی ایسی بہت سی خصوصیات جن پر اس کی بڑائی اور اہمیت کا انحصار ہے۔ ''عجائب القصص'' میں مل جاتی ہیں۔ جو برسوں پہلے لکھی گئی تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ باغ و بہار کے مقابلے میں عجائب القصص کی قدر شناسی میں بخل اور بے نیازی سے کام لیا جارہا ہے۔''

''ترقی پسند تنقید اور اردو فکشن'' کتاب ''موضوعات'' کا چوتھا مضمون ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ترقی پسند تحریک کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے ترقی پسند نقاد کے کارناموں پر تنقیدی نگاہ سے وار کیا ہے۔ اور فکشن تنقید میں انجام پائے کارناموں کو جس طرح مولانا حالؔی، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، محمد حسین آزاد، محمود شیرانی، حامد حسین قادری، عبدالماجد دریابادی، مسعود حسین ادیب، سجاد ظہیر، اختر انصاری، احتشام حسین وغیرہ نے گراں قدر کارنامے انجام دئے ان کو تہداری سے پیش کیا۔ یہ بات جانب حق ہے کہ ترقی پسند تحریک سے اردو تنقید میں مارکسی اور اشتراکی تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔ مارکسؔ کے فلسفہ سے معمور جو نقاد اس وقت تنقیدی تحریر رقم کر رہے تھے ان میں زیادہ تر ناقدین کی تنقیدی تحریریں سائنٹی فک تحریں تھیں۔ ان تحریروں میں کارل مارکسؔ کا نظریہ صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ ناقدین کی تحریروں میں جمالیات کے عناصر بھی نظر آرہے تھے جن میں سماجی و تاریخی حالات اور معاشیات کی منظر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کا یہ اقتباس دیکھئے:

> ''ترقی پسند تنقید دراصل الگ سے کوئی تنقیدی رویہ یا نظریہ نہیں ہے بلکہ یہ مارکس کے فلسفہ کی راہ سے ادب میں داخل ہوئی۔ یہ ادب کو سماجیات، تاریخی حالات اور معاشیات کے عینک سے بھی دیکھتی ہے۔ اور ایک سائنٹی فک نظریہ تنقید کی تشکیل کرتی ہے۔''

(موضوعات، ص، 66، ارتضیٰ کریم)

یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند تنقید میں اشتراکی و غیر اشتراکی، مارکسی اور غیر مارکسی سبھی قسم کے ناقد شامل رہے۔ سجاد ظہیر ایسے منفرد ناقد ہیں جن کے یہاں خیالات میں تہداری اور گہرائی

ملتی ہے۔ وہ انسانی زندگی کو بہتر طور پر صحت مند انداز میں پیش کرنے کا خوبصورت فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ اپنے ادب میں وہ تجربے کو خوب اہمیت دیتے ہیں۔ اور تسلیم کرتے ہیں کہ جب تک ادیب کے پاس تجربہ نہیں ہوگا وہ اپنے تجربہ کے مطابق اچھی اور بہتر تخلیق پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وقار عظیم نے ادب کو زندگی کا ترجمان تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ادب کو وہ ایک تاریخی ارتقاء کا ایک اہم حصہ سمجھتے ہیں۔ اختر حسین رائے پوری کا ایک مضمون ''ادب اور زندگی'' اور دوسرا مضمون ''ادب اور انقلاب'' کے نام سے شائع ہوئے۔ جب ہم اختر حسین رائے پوری کی تنقیدی تحریریں مطالعہ میں لاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے نظریات ترقی پسندوں کے نظریات تجربات اور حالات سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ ان کی تنقیدی تحریروں اور مضامین میں مارکسی تنقید کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

سید احتشام حسین بھی ترقی پسند ناقدین میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ تنقید کو ایک مشکل فن قرار دیتے ہیں۔ دیگر ترقی پسند ناقدین کی طرح سید احتشام حسین بھی ادب کو سماجی زندگی کا ایک اہم ترجمان قرار دیتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایک ادیب کا کام صرف سماج میں حالات ومسائل کی تصاویر پیش کرنا نہیں ہے بلکہ سماجی مسائل کا کوئی حل بھی تلاش کر کے عوام کو صحیح راہ راست پر بھی لانا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ادب تمام علوم کی روشنی میں دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ عزیز احمد کی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس جاگتا ہے کہ عزیز احمد نے فن تنقید کا مطالعہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ کسی ایک تنقیدی نقطۂ نظر پر اعتماد نہیں رکھنا چاہیے بلکہ یوروپ کے تمام ادب کی تنقیدی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہ بھی ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی زاویوں میں علمیت نظر آتی ہے۔ تجربات کے عناصر معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم بھی اپنی کئی اہم تنقیدی تصانیف میں علمیت کی بدولت ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی مقبولیت کی دوسری وجہ ان کی سخت گیری اور تہہ دار نظر ہے۔

کتاب ''جدید تنقید کا منظر نامہ'' پروفیسر ارتضیٰ کریم کی ایک اہم تخلیق ہے۔ جو ابواب کی فہرست کے مطابق دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ ''منظر نامہ ایک'' کے نام سے ہے اس میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کا مضمون ''جدید تنقید کا منظر نامہ'' پیش لفظ کے بطور لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس حصہ میں پندرہ تنقیدی مضامین تحریر کئے گئے ہیں۔ فہرست کا دوسرا حصہ اکیس تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کو تحریر کرنے والے، لئیق بابری، محمد تاثر علی، صبیح الدین

احمد، صدیق کلیم، ظہور الحق شیخ، منظور الحق، ضیاء الرحمٰن خان، خالد احمد، سہیل صفدر، بختیار حسین صدیقی، ڈاکٹر عبدالحی، عبدالعزیز بٹ، حسن ضیا، قاضی قیصر الاسلام، سید عابد علی عابد، ابوالکلام قاسمی، کے کے کرشنا مورتی، عنبر بہرائچی، سید احتشام حسین، محمد حسن، قمر رئیس، آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، ساجدہ زیدی، عتیق اللہ، گوپی چند نارنگ، احمد سہیل، وہاب اشرفی، ضمیر علی بدایونی، حامدی کاشمیری وغیرہ نے جدید تنقید کے منظر نامے کو تنقیدی اصولوں وزاویوں کو سامنے رکھتے ہوئے پیش کیا ہے۔ ان ناقدین کی تنقیدی تحریریں پڑھتے ہوئے ناقد کی ذہنی ساخت اور ناقدانہ مزاج سے واقفیت بھی ہو جاتی ہے۔ ارتضیٰ کریم کی تنقیدی کتاب ''جدید تنقید کا منظر نامہ'' میں محمد حسن نے تنقیدی مضمون ''مارکسی نظریۂ تنقید'' کے نام سے تحریر کیا ہے۔ دراصل پروفیسر محمد حسن کا نام ترقی پسند ناقدین میں شمار ہوتا ہے۔ ''ادبی تنقید'' ان کا اہم تنقیدی مجموعہ ہے۔ جس میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے اہم مضامین تحریر کئے گئے ہیں۔ محمد حسن یہ بات تسلم کرتے ہیں کہ کوئی بھی ترقی پسند تخلیق یا تصنیف اپنی ایک آدرش اہمیت نہیں رکھتی۔ نظریاتی شاعری اور فکشن پر اہم تنقیدی مضامین نے محمد حسن کی ناقدانہ بصیرت کو پیش کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ جب تک کسی فن پارے کو اندر باہر سے مطالعہ میں نہ لایا جائے تو اس پر کسی طرح کی تنقید اہمیت نہیں رکھتی۔ محمد حسن کا یہ اقتباس دیکھئے:

> ''جب کسی فن پارے کو ترقی پسند کہا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے ایک آدرش کی حیثیت نہیں دی جاتی۔ مارکسی نقاد اس فن پارے کے اندرونی تجزیے سے منہ نہیں موڑتا اور ایک لمحے کے لئے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ اس سے بہتر اور اس سے زیادہ ترقی پسند تخلیق ممکن نہیں ہے۔ ترقی پسند کہنے کے معنی یہ نہیں کہ وہ اس کی حدود سے آگاہ ہے۔ وہ اس کی اندرونی ترتیب اور کمزوریوں کو بھی واضح کرتا ہے۔''

(جدید تنقید کا منظر نامہ، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ص، 371 موڈرن پبلی شنگ ہاؤس دہلی 2003ء)

پروفیسر محمد حسن کی ایک منفرد حیثیت یہ بھی ہے کہ وہ دیگر ناقدین سے کچھ منفرد نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ ادب میں سماجی تاریخی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تہذیبی قدروں کو بھی شامل رکھتے ہیں۔ اور فن پاروں میں تہذیبی عناصر کو تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کیجئے:

> ''محمد حسن نے بھی ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں نظریاتی مضامین لکھے اور

شاعری پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالی، اور فکشن پر بھی بہت کچھ لکھا۔ ان مضامین میں ان کے تنقیدی نقطۂ نظر کی تلاش کی جاسکتی ہے۔ یہ دوسرے مارکسی یا ترقی پسند ناقدین سے ان معنوں میں الگ ہو جاتے ہیں کہ وہ ادب میں سماجی اور تاریخی پہلوؤں کے ساتھ اس کے تہذیبی پس منظر پر بھی نگاہ رکھتے ہیں، اور کسی فن پارے کی پرکھ میں تہذیبی پہلوؤں کی بھی تلاش کرتے ہیں۔''

(موضوعات، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ص، 74)

پروفیسر قمر رئیس ایک معتبر ناقد ہیں۔ فکشن تنقید پر انہوں نے زوردار قلم چلایا ہے۔ ترقی پسند ناقدین میں اگر کسی ناقد نے افسانوی ادب پر زیادہ تنقید کی ہے تو وہ پروفیسر قمر رئیس ہی ہیں۔ بعض ناقدین ادب ایسے بھی ہیں جو مارکسی نظریہ سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ترقی پسند نظریۂ فن سے معمور اور متاثر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر اپنے آپ کو مارکسی نہیں کہلاتے جبکہ سماجی مسائل اور عوامی جذبات کی عکاسی منفرد انداز میں کرتے ہیں جب ایسے ناقدین کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی تصانیف کو ترقی پسند تصانیف کا درجہ ہی دیا جاتا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے منشی پریم چند کے ناولوں اور افسانوں پر سیر حاصل تنقیدی گفتگو کی ہے۔ کیونکہ منشی پریم چند سماجی مسائل سے بخوبی آشنا تھے۔ اس لئے قمر رئیس نے سماجی منصب و مسائل پر تہدار تنقیدی نظریات پیش کئے ہیں۔ تمام تنقیدی مضامین میں انسان دوست، سماجی حقیقت نگاری، عام انسانوں کے مسائل اور ان کا حل بھی شامل ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کی کتاب ''جدید تنقید کا منظر نامہ'' میں پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''ترقی پسند ادب کی رعایت سے ترقی پسند تنقید'' اردو کی اپنی ایجاد ہے۔ اور اسے بین الاقوامی اصطلاح کی سند حاصل نہیں ہے۔ اس کے اسباب بھی موجود ہیں کہ مارکسی تنقید اور ترقی پسند تنقید میں فرق کیا جائے۔ اس لئے کہ مذکورہ نقادوں کے علاوہ اختر انصاری، ڈاکٹر سلامت اللہ خاں اور سید مجتبیٰ حسین سے لے کر وحید اختر، فضل امام، محمد علی صدیقی، تبسم کشمیری، آغا سہیل اور فضیل جعفری تک ایسے ناقدین کی ایک بڑی تعداد ہے جو اپنے آپ کو مارکسی نہیں کہلاتے لیکن جو ایک طرف مارکسزم، تو دوسری طرف ترقی پسند نظریۂ فن، اس کے ادب اور اقدار سے متاثر رہے ہیں اور جو دوسرے تصورات کو رد کرتے ہوئے ادب کے سماجی منصب اور غایتی کردار کو اپنے

اصول تنقید میں ترجیہی اہمیت دیتے آئے ہیں۔اگر ان کی تنقید کو کسی اصطلاح
کے حوالے سے پہچانا ضروری ہوتو اسے ''ترقی پسند تنقید'' ہی کہنا مناسب
ہوگا۔''

(جدید تنقید کا منظر نامہ،ارتضیٰ کریم،ص،378)

اردو افسانوی ادب پر ترقی پسند ناقدین نے اپنے تجربات تصورات اور خیالات کے ذریعہ خوب لکھا ہے۔تنقیدی تحریروں سے افسانوی ادب کو مالا مال کیا۔فکشن تنقید پر ان ناقدین نے خوب سے خوب تر مضامین کے ذریعہ اپنے دعوؤں کو پیش کیا۔مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک سے قبل افسانوی ادب پر بہت کم تنقیدی تصانیف تحریر ہوئیں۔فکشن تنقید کے فروغ میں پروفیسر وقار عظیم، احتشام حسین، قمر رئیس، اختر انصاری وغیرہ نے نمایاں تنقیدی کارنامے انجام دیے۔

''ترقی پسند تحریک اور بہار کا اردو افسانہ'' کتاب ''موضوعات'' کا پانچواں مضمون ہے۔اس باب میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ترقی پسند تحریک پر بھر پور روشنی ڈالتے ہوئے بہار کے اردو افسانے پر تہدار تنقیدی رجحان کو قارئین کے روبرو پیش کیا ہے۔ترقی پسند تحریک سے ادب کا ہر قاری واقف ہے کیونکہ ادب کا ہر طالب علم یہ تسلیم کرتا ہے کہ ترقی پسند ادب ایک ادبی تحریک ہے۔سرسید تحریک کی مانند ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کی مقبول صنف افسانہ کی خوب خدمت کی۔اور افسانے کے میدان کو وسیع کیا۔سرسید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے اپنے تعلیمی مشن میں حد سے بڑھ کر قربانیاں دیں۔اور اس تحریک سے جڑے ہونے کے بعد بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ سرسید تحریک کوئی ادبی تحریک ہے۔ترقی پسند تحریک کے شعراء اور ادباء نے مل کر غلام ملک کو آزاد کرانے میں اپنا اہم رول ادا کیا۔نذیر احمد کی ناول نگاری کے بعد جو ادب میں الگ الگ نظریات،تحریکات وجود میں آئے ان کو سرسید تحریک کا نام دیا گیا۔اور آہستہ آہستہ سر سید تحریک مقامی اور مذہبی بن کر رہ گئی،مگر ترقی پسند تحریک کے نظریات وعقائد قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی تھے۔اس طرح ترقی پسند تحریک نے بین الاقوامی سطح پر ادب کے ناقدین، قارئین کو اپنے ساتھ شریک کرلیا۔پروفیسر ارتضیٰ کریم کی اہم تصنیف ''جدید تنقید کا منظر نامہ'' میں پروفیسر قمر رئیس کا یہ اقتباس دیکھئے:

''تقریباً دو دہائیوں تک سرسید یا ان کے رفقاء میں سے کسی نے ادعا نہیں کیا
کہ یہ کوئی ادبی تحریک بھی ہے۔جتنی تبدیلیاں بشمول حالؔی و آزؔاد کے جدید

شاعری کے منشور کے یا نذیر احمد کی ناول نگاری کے واقع ہوئیں ان کو ''سرسید تحریک'' کا نام بہت بعد کو تاریخ نے دیا۔۔۔۔اسی طرح ترقی پسندی بھی اس اعتبار سے یکتا تھی کہ سرسید تحریک کے محرکات مقامی و مذہبی تھے۔لیکن ترقی پسند تحریک کے محرکات مقامی سے بڑھ کر بین الاقوامی، غیر مذہبی اور سیاسی تھے۔''

(جدید تنقید کا منظر نامہ، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ص، 544)

ترقی پسند تحریک نے ملک کے باشندوں میں اتحاد و اتفاق کی بنیاد ڈالی۔اور یہ بھی حق ہے کہ سرسید نے تعلیمی مشن میں جو کارنامہ انجام دیا تو سرسید قوم کے بڑے رہنما، مفکر قوم اور اہم شخصیت کے مالک بنے اور ان کے ساتھیوں میں کسی نے ان کے اس تعلیمی مشن، یا کارناموں کو تحریک کی شکل میں نہیں دیکھا۔اور نہ ہی کسی علمی ادبی تنظیم سے اسے تعبیر کیا۔ بلکہ سرسید کے تعلیمی مشن کی دو دہائیوں کے بعد حالی، آزاد نذیر احمد وغیرہ نے انکی تعلیمی عظمت کا احترام کیا۔اس کے علاوہ وہ ترقی پسند ادباء اور شعرائے ملک کے باشندوں میں اتحاد اتفاق پیدا کرنے کی غرض سے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ عوام کو بیدار کیا۔ ملک ہندوستان کے باشندوں میں قومی بیداری، ملک سے محبت، وطن سے عظمت و فلاح بہبود کے لئے عوام کو تخیلاتی دنیا سے نکالا۔مولانا الطاف حسین حالی، اقبال، جوش، سجاد ظہیر، فیض، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، پریم چند، شکیل اختر، منٹو، عصمت چغتائی، اختر انصاری، خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، عزیز احمد وغیرہ نے اردو زبان و ادب کی تصانیف نظم، غزل، مرثیہ، قصیدہ، ناول، افسانہ وغیرہ کو خوب مالا مال کیا۔مولانا الطاف حسین حالی اردو تنقید کا معتبر نام تسلم کیا جاتا ہے۔آپ کے وسعت مطالعہ اور تنقیدی نظریات میں سمندر کی سی گہرائی نظر آتی ہے۔انگریزی ادب کے مطالعہ نے موصوف کے تنقیدی شعور میں چار چاند لگائے۔مشرقی ادب کو پروان چڑھانے میں حالی کے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ادب کے قارئین حالی کو اردو ادب کی تنقید کے صف اول میں پہلا مقام دیتے ہیں۔شیفتہ، غالب اور سرسید کی صحبت میں زندگی گزارنے والا پہلا ناقد یعنی مولانا الطاف حسین حالی کا ذہن تیز رفتاری سے اپنے شعور کو پروان چڑھا رہا تھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا حالی نظم کے امام بن گئے اور اپنی ایک اہم نظم ''برکھا رت'' قارئین کے روبرو پیش کر کے ثابت کر دیا کہ وہ ایک نظم نگار، ناقد کے ساتھ ساتھ مساوات اور بھائی چارے کے بھی علمبردار تھے۔اردو ادب میں ممتاز فکشن نگار اور ناقد کی حیثیت سے

عصمت چغتائی نے بھی خوب خوب تنقیدی تحریریں رقم کی ہیں۔ وہ تسلیم کرتی ہیں کہ بہت سے ناقدین آنکھ بند کر کے کسی بھی فن پارے پر اپنی رائے دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ بنا سچائی اور تحقیق کئے رائے دینا اپنا ذاتی حق سمجھ بیٹھتے ہیں۔ جب عصمت چغتائی پر بنا سوچے سمجھے تنقیدی تحریریں رقم ہونے لگیں تو عصمت چغتائی یہ کہنے پر مجبور ہو گئیں کہ

''ہمارے اکثر ناقدین لکیر کے فقیر ہیں۔''

عصمت چغتائی یہ تسلیم کرتی ہیں کہ ہمارے ناقدین کو غبار آلود فضا کو صاف کرنے کا کام انجام دینا چاہیے۔ سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے اہم شخصیات میں سے ہیں۔ آپ ناول نگار بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ تنقید بھی ان کا میدان رہا ہے۔ وہ ادب اور زندگی کے ہم آہنگ کے طرفدار ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک سچے ادیب کو ادبی تحقیقات میں کشمکش کو درجہ اول میں جگہ دینا چاہیے۔

ترقی پسند ادباء میں سید احتشام حسین ایک ممتاز نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''تنقیدی جائزے'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس کے ذریعہ احتشام حسین کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ حالانکہ وہ تنقید کو ایک مشکل فن قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے حل تلاش کر کے عوام کو صحیح راستہ دکھانا ہوتا ہے۔ آل احمد سرور کو سائنٹی فک رجحان کا علمبردار قرار دیا گیا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ کشادہ دل، نقطۂ نظر، غیر جانب دارانہ، انصاف پسندی، شعور میں سنجیدگی ایک ادیب کے لئے اشد ضروری ہیں۔ منشی پریم چند کو ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس میں بنگال، گجرات، مہاراشٹر، مدراس وغیرہ مقامات سے ادیب شامل ہوئے۔ ان ادباء و شعراء نے نہ صرف سماجی عوام کو بیدار کیا بلکہ ادب کی اصناف کو بھی تقویت عطا کی۔ افسانہ کی تاریخ ان ادباء کے بنا بے معنی تصور کی جائے گی۔ ان ادباء کے دور کو افسانے کا زریں دور کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان ادباء کے افسانوں میں سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ آزادی حاصل کرنے کی تڑپ بھی دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ بھی حق ہے کہ اس عہد زریں کی رہنمائی بھی منشی پریم چند ہی کر رہے تھے جس سے حقیقت پسندی کے رجحانات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم اپنی کتاب ''موضوعات'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ افسانے کا زریں اور وقیع عہد کہا جاتا ہے جس میں ملکی سطح پر احمد علی، محمود الظفر، سجاد ظہیر، رشید جہاں، منٹو، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ افسانہ

نگار شامل ہیں۔اور انہیں کے شانہ بہ شانہ بہار کے افسانہ نگاروں میں اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، سید محمد محسن ، شکیلہ اختر وغیرہ کے نام آتے ہیں۔اس دور کے اکثر افسانے ترقی پسند خیالات اور رجحانات پر مبنی ہیں۔ ان میں آزادی کی خواہش ملتی ہے۔سماج کے مظالم اور سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت کا اظہار ملتا ہے،طبقاتی کشمکش، بھوک اور افلاس کے موضوعات پر بھی افسانے لکھے گئے۔زندگی کے بعض دوسرے تلخ حقائق کی نقاب کشائی بھی پوری شدت سے کی گئی۔اس عہد کی رہنمائی پریم چند فرمارہے تھے:افسانے میں حقیقت پسندی کا رجحان عام ہوتا گیا۔''

قابل غور بات یہ ہے کہ منشی پریم چند نے افسانوں کو جدید موضوعات تو عطا کئے ہی اس کے ساتھ ساتھ اپنے موضوعات میں تہداری اور فنی تکنیک کو بھی استعمال کیا۔موضوعات کو وسیع کیا۔عام انسانوں کے دکھ، درد، کسک،مزدوروں کے المیاتی جذبات اور سنجیدگی، گونجتی ہوئی چیخ و پکار ان کے افسانوں کو نئی معنویت عطا کرتے ہیں۔بہت سے افسانہ نگاروں نے ان کی روایت کو آگے بڑھانے کا خاصا کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔ان افسانہ نگاروں میں بہار کے اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، غیاث احمد گدی، احمد یوسف وغیرہ نے افسانے کی زلفوں کو سنوارا۔اختر اورینوی اردو ادب کے اہم ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔انہوں نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی، ڈرامے بھی تحریر کئے اور تنقیدی کارنامے بھی انجام دئے ،لیکن جب ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں افسانہ نگاروں کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں۔انہوں نے چھ افسانوی مجموعے افسانوی ادب کو دئے۔منظر پس منظر'،'سیمنٹ اور ڈائنامایٹ'،'کلیاں اور کانٹے'،'انارکلی اور بھول بھلیاں'،'سپنوں کے دیس میں'،'کینچلیا اور بال جبریل' وغیرہ۔اختر اورینوی کا مطالعہ وسیع ہے افسانوں نے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔سماج میں پھیلے مسائل ان کے افسانوں میں مچلتے نظر آتے ہیں جس طرح منشی پریم چند نے دیہی مسائل اور غریب مزدوروں کے دکھ درد کی کسک کو قریب سے محسوس کیا اسی طرح اختر اورینوی نے بھی پریم چند کی مانند دیہی پس منظر میں بہت سے افسانے لکھے جن میں غریب ، مزدور، بے بس مفلسی میں زندگی گزارنے والی خواتین اور نامراد مردوں کے غموں کا سمندر نظر آتا ہے۔حالانکہ ترقی پسند تحریک کے وقت سے ہی ان کے افسانوی سفر میں چمک محسوس ہوئی مگر بعد میں وہ کسی تحریک سے وابستہ نہ رہے نہ ہی کسی تحریک سے متاثر ہوکر انہوں نے کوئی تخلیق عوام

کے سامنے پیش کی۔وہ کسی تحریک سے متاثر نہ ہوئے بلکہ اپنے تجربات کی بنا پر ان کی افسانہ نگاری کی قدر ہوئی مگر بہتر طور پر وہ دیگر افسانہ نگاروں کی مانند ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل نہ ہو سکے۔اختر اورینوی کی افسانہ نگاری پر ممتاز ناقد پروفیسر ارتضٰی کریم نے جہاں کھل کر تنقیدی نظریات پیش کئے ہیں وہیں انہوں نے اپنی کتاب ''اردو فکشن کی تنقید'' میں تخلیقی تنقید کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔اختر اورینوی نے اچھے افسانے تو لکھے مگر ان کے مقابلے میں سہیل عظیم آبادی زیادہ ترقی پسند افسانہ نگار بن کر اُبھرے،اور ترقی پسند تحریک کو خوب سمجھا پرکھا،تب بہار میں منشی پریم چند کی طرز پر کام کرنے کی کوشش کی۔غریبوں کی مجبوری کو محسوس کیا۔زمیندارانہ نظام کی بربریت کو دیکھا۔بھوک پیاس میں پرورش پاتے کسان مزدور کی حالت زار کو اپنا دکھ درد سمجھتے ہوئے آنسو بہائے،مگر یہ بھی سچ ہے کہ انہوں نے منشی پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا لیکن اس روایت کے اسیر نہیں بنے بلکہ منشی پریم چند کی روایت کو محسوس بھی کیا اور اپنے لئے نئی راہ کا بھی انتخاب کیا۔اسی لئے ان کے یہاں افسانہ نگاری کی نئی فہم کا پتہ چلتا ہے۔بہار میں انہوں نے پریم چند کی روایت کو اتنا استحکام عطا کیا کہ پروفیسر ارتضٰی کریم ان کو بہار کا پریم چند تسلیم کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں پریم چند کی طرح انسان دوستی، وطن پرستی،غریبوں مزدوروں سے پیار و محبت کا جذبہ نظر آتا ہے۔پروفیسر ارتضٰی کریم کے بقول ''اختر اورینوی کے مقابلہ میں سہیل عظیم آبادی نے ترقی پسند تحریک کے مقاصد کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا اور پرکھا اور انہیں بہار کا پریم چند تسلیم کرتے ہیں۔''

سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی کے افسانوں میں عام انسانوں کی زندگی دکھائی دیتی ہے۔ان کی افسانہ نگاری کے تجزیہ سے یہ راز فاش ہوتا ہے کہ ان کا ہر جملہ معنوی جہات کی نئی پرتیں کھولتا ہے۔افسانوں کے موضوعات اور کہانی میں غریبی، بے کاری، ناداری کے مسائل خاندان کے افراد میں ذہنی بے چینی حالات کی مار وغیرہ بھی شامل ہیں۔سہیل عظیم آبادی کے افسانوی ادب سے متاثر ہو کر غیاث احمد گدی، انور عظیم، کلام حیدری، احمد یوسف، وہاب اشرفی، الیاس احمد گدی وغیرہ نے بھی افسانوی ادب میں طبع آزمائی کی۔ان ادباء کی افسانہ نگاری پر جب نظر جا کر رکتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے افسانوں میں سہیل عظیم آبادی کے اسلوب کی چمک ہے مگر ان افسانہ نگاروں نے بھی بعد میں اپنی ایک منفرد راہ قائم کی،اور حالات و مسائل کو محسوس کرتے ہوئے سماج کے نئے نئے موضوعات و مسائل کو افسانوں میں پیش کیا۔غیاث احمد گدی نے بہار کے اردو افسانہ نگاروں میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ان کے افسانوی مجموعے بابا

لوگ، پرندہ پکڑنے والی گاڑی، سارا دن دھوپ، اپنے اسلوب، موضوعات، مواد، اور تکنیک کے اعتبار سے تہداری اور گہرائی لئے ہوئے ہیں۔ انور عظیم کا تعلق بھی ترقی پسند افسانہ نگاروں سے ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات کی بنا پر کہانیوں کو نئی وسعت، فنی چابکدستی اور جدت پسندی عطا کی۔ احمد یوسف بھی بہار کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے روشنی کی کشتیاں، آگ کے ہم سائے، 23 گھنٹے کا شہر، شائع ہو کر قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

شکیلہ اختر بھی ایسی افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ترقی پسند افسانے میں اپنی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ پریم چند سے عہد حاضر تک افسانوں میں نئے تجربات ہوئے، نئے تکنیک پیدا ہوئی، نئے اسلوب کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ نئے اسلوب نئی تکنیک اور نئے منظر نامے میں افسانہ نگاروں نے ہر طرح کی کہانیاں لکھیں۔ تحریری اور علامتی کہانیاں بھی خوب لکھی گئیں۔ رومانی کہانیوں کا دائرہ بھی کافی وسیع رہا۔ بہار میں ایسے افسانے کافی تعداد میں لکھے گئے۔ ان افسانہ نگاروں میں ظفر اوگانوی، شوکت حیات، اختر یوسف، شفق رضوان احمد وغیرہ کے نام بڑے اہم ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے پرانی روش کو ٹھکراتے ہوئے افسانے کی صنف کو جدید طریقہ عطا کیا۔ مگر ان افسانہ نگاروں میں شفق اور شوکت حیات نے خود کو پرانی روایت سے جوڑے رکھا اور اس کی یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر تک ان کی افسانہ نگاری قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتی رہی ہے۔

جب قومی سطح پر افسانہ نگاروں اور ان کی تخلیقات پر نظر جاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج ملک ہندوستان کے کہانی کاروں میں جوگندر پال، رام لعل، اقبال مجید، انور خان، سلام بن رزاق، سید محمد اشرف، ابن کنول، انجم عثمانی، اسلم جمشید پوری وغیرہ اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں ساتھ ہی ماحول و معاشرہ میں عمدہ زبان، معیاری ادب اور جمالیاتی اقدار سے افسانوی ادب میں نکھار پیدا کر رہے ہیں۔ بہار کے افسانہ نگاروں میں بھی ذکیہ مشہدی، قاسم خورشید، مشرف عالم ذوقی، احمد صغیر، مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ نے عمدہ کہانیاں لکھ کر سماجی مسائل و موضوعات کو پیش کیا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید اپنی کتاب ''متن معنی اور تھیوری'' میں کیا خوب لکھتے ہیں: ''اتنی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ کسی بھی معاشرہ میں زبان و ادب اور جمالیات اقدار کا بنیادی تعلق تہذیب و ثقافت سے ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے تہذیب و ثقافت کی نئی متضاد و مخالف لہریں اور دائرے زبان و ادب اور ادب کی جمالیاتی اقدار بھی نئی متضاد و مخالف لہروں اور دائروں

کی تشکیل کا سبب بنتے ہیں۔'' مجموعی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کی روایت اردو افسانے میں ابتداء سے آج تک رہی۔اس لئے افسانے میں آج بھی نئے اسلوب، نئی حیات و حقائق نظر آتے ہیں بہار کے کہانی کاروں نے یہاں اور خاص طور پر ملک ہندوستان کے زیادہ تر افسانہ نگاروں کے یہاں ترقی پسند تحریک کے اثرات نظر آتے ہیں۔

کتاب ''موضوعات'' کا چھٹا مضمون ''اردو مثنویوں کی کہانیاں اور اس عہد کا سماج'' ہے۔اس مضمون میں پروفیسر ارتضٰی کریم نے اردو شاعری کی صنف مثنوی اور اس کے عہد پر نمایاں اختلافی مسائل اور اس کے متعلق بعض ناقدانہ مباحث پر مشتمل یہ مضمون تحریر کیا ہے۔ دراصل مثنوی اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں مضمون سلسلے وار اور اشعار کی حد مقرر نہ ہو۔اگر اس کو ہم نظمیہ داستان بھی کہیں تو غلط نہ ہوگا۔فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں صنف مثنوی اپنا اہم مقام رکھتی ہے۔اس میں عام انسانوں کی کیفیت، خوشی غم، حسن وعشق، مافوق الفطرت عناصر ملتے ہیں۔میدان جنگ کے ہنگامے، موت کی رسمیں انسانی تہذیبی قدریں مذہبی تعلیم کے مسائل کا بیان نظم کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں مختلف اصناف شاعری کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ مختلف مثنویوں میں اعلیٰ اور دلکش نمونے ملتے ہیں۔دکن میں بہت سی مثنویاں منظر عام پر آئیں۔شمالی ہند میں کافی تعداد میں مثنویاں لکھی گئیں۔لیکن مرزا شوقؔ کی مثنوی 'زہر عشق' پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی مثنوی 'گلزار نسیم'، میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' میر اثر دہلوی کی مثنوی 'خواب وخیال' قابل ذکر ہیں، جن کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

مثنوی کی اہم خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔مضمون کچھ بھی ہو لیکن حقیقت پر مبنی ہو۔تسلسل کا ہونا شرط ہے۔ ہر شعر اپنے پہلے شعر سے مربوط ہونا ضروری ہے۔پروفیسر ارتضٰی کریم بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ ''مسلسل مضامین کا بہتر بیان مثنوی میں ہی ممکن ہے۔یہ مضامین اخلاقی، اصلاحی، تاریخی صوفیانہ کسی بھی نوعیت کے ہو سکتے ہیں'' مثنوی میں ہر دور کا ماحول اور معاشرت ملتی ہے۔ ہر طرح کے مضامین مثنوی میں بیان کئے جاتے ہیں۔پروفیسر ارتضٰی کریم کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''اردو کے اہم نقاد نے غزل کی تثلیث غالبؔ، میرؔ اور شاد کو بتایا ہے۔مثنوی کی تثلیث میر حسنؔ دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق سے تشکیل پاتی ہے۔۔۔۔۔ یہ مثنوی کی خوش بختی ہے کہ غزل کی طرح اسے نیم وحشی یا قابل گردن زدنی نہیں کہا گیا، بلکہ اکثر نقاد اس کی وسیع القلبی یا وسیع المشربی کے قائل ہو

گئے ۔اسے اردو شاعری کی تمام اصناف میں زیادہ کارآمد صنف قرار دیا گیا۔ کیونکہ مسلسل مضامین کا بہتر بیان مثنوی میں ہی ممکن ہے۔ یہ مضامین اخلاقی ،اصلاحی ،تاریخی اور صوفیانہ کسی بھی نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اردو کی زیادہ تر مثنویوں میں عشقیہ مضامین ملتے ہیں۔''

(موضوعات،ص،95ارتضٰی کریم)

مثنویوں میں بادشاہ،شہزادے ،وزیر،حکومت،سلطنت ،عوام ،جاگیردارانہ نظام ،جنت ،پریوں وغیرہ کا منفرد انداز میں بیان ملتا ہے۔مثنویوں میں ''مثنوی قطب مشتری'' ملاوجہی کی اہم تصنیف ہے جس میں قلی قطب شاہ کے عشق کی واردات کو منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔قطب شاہ کا درباری شاعر ملاوجہی نے نہ صرف یہ داستان لکھی بلکہ ''سب رس'' جیسی اہم تصنیف لکھ کر وہ عہد حاضر تک اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔مثنوی ''قطب مشتری'' کے کرداروں کو حقیقی زندگی دی گئی ہے،مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مثنوی کے کردار اپنی کردار نگاری میں کامیاب نہیں ہو پاتے ۔اس کے علاوہ مثنوی ''سحرالبیان'' بھی کافی مقبول ہے جسے میر حسن نے اٹھارویں صدی کے آخری دور میں لکھا تھا۔اس مثنوی میں لکھنوی معاشرے کا فنکارانہ بیان ملتا ہے۔دہلی کی روح لکھنؤ کی تہذیب جب ایک جگہ ملتی ہے تو مثنوی ''سحرالبیان'' سامنے آتی ہے۔جس میں میر حسن نے کرداروں کے ذریعہ اس عہد کے ماحول کی خوبصورت عکاسی پیش کی ہے۔پریوں، جنوں، بادشاہوں،شہزادوں سے انوکھے واقعات کو بیان کرایا ہے۔ان مافوق الفطرت کرداروں کے ذریعہ قصے میں دلچسپی کو برقرار رکھا گیا ہے بقول پروفیسر ارتضٰی کریم ''میرا مقصد سحرالبیان میں ماحول کی پیش کش'' سے نہیں بلکہ اس ماحول کی عکاسی میں میر حسن نے پریوں اور جنوں یا مافوق الفطری کردار سے جو کام لیا ہے۔اسکی وضاحت ہے ۔ایک طرف تو ان کی مدد سے قصے میں دلچسپی بڑھتی ہے۔قاری عجیب عجیب واقعات دیکھ اور پڑھ کر متحیر اور متعجب ہوتا ہے۔اس حیران کن اور انوکھے واقعات کو وہ مشکوک نگاہوں سے اس لئے نہیں دیکھتا کہ ان پر اس کا اعتقاد اور یقین ہے۔دوسری جانب اس کے پس پردہ اس عہد مخصوص کی تصویر کشی بھی مثنوی نگار یا قصہ گو کا مقصد ہوتا ہے۔''

یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر ارتضٰی کریم عصر حاضر کے ایسے ممتاز ناقدین کی فہرست میں شامل ہیں جو تنقیدی شعور و نقد تصانیف کے اسرار و رموز سے مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔ انہوں نے عہد حاضر کے فکشن تنقید کے میدان میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ارتضٰی کریم

متعدد تنقیدی نظریات کو وقتاً فوقتاً متعارف کراتے رہے ہیں۔

''خواجہ احمد عباس، بلاعنوان'' تصنیف ''موضوعات'' کا ساتواں مضمون ہے۔جس میں خواجہ احمد عباس کے مجموعہ کلام کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے ان کے تمام کارناموں پر تنقیدی بحث کی گئی ہے۔اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ عصر حاضر میں خواجہ احمد عباس کی معنویت دیگر ادباء سے کم نہیں ہے۔خواجہ احمد عباس ایک اہم افسانہ نگار، ممتاز جرنلسٹ، کامیاب ناول نگار، مقبول فلم ڈائریکٹر، مشہور ڈرامہ نگار، اعلیٰ درجہ کے سوانح نگار اور عمدہ مضمون نگار تھے۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے فلمی دنیا کے بے تاج بادشاہ امیتاب بچن کے ساتھ مل کر پہلی بار اپنی فلم ''سات ہندوستانی'' میں کام کیا۔خواجہ احمد عباس ترقی پسند ادیب تھے۔انہوں نے ہندی اور انگریزی میں لکھنے کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی پچاس سے زائد کتابیں تحریر کیں جن میں افسانوی مجموعے، ناول، ڈرامے، مضامین، سفرنامے وغیرہ ہیں۔ممتاز ناقد ڈاکٹر صادقؔ نے اپنی تنقیدی رائے کی تشکیل میں وضاحت کے ساتھ ترقی پسند افسانہ نگار خواجہ احمد عباس کا مختصر مطالعہ پیش کر کے ان کی ادبی تصانیف پر تنقیدی گفتگو کی ہے۔مگر تعجب خیز بات یہ ہے کہ خواجہ احمد عباس نے جتنا زیادہ لکھا ان پر اتنا ہی کم دھیان دیا گیا۔ناقدین ادب نے بھی خواجہ احمد عباس پر زیادہ تنقیدی قلم نہیں چلائے صرف سرسری تنقیدی مضامین ہی سپرد قلم کئے ہیں۔اسی بات کو پروفیسر ارتضیٰ کریم نے منفرد انداز بیان میں اس طرح تحریر کیا ہے:

> انہوں نے سیکڑوں افسانے لکھے لیکن اردو افسانے کی ALPHABETS میں کبھی شریک نہ ہو سکے۔اردو افسانے کی Alphabets یعنی پریم چند، کرشن چندر، منٹو، عصمت، بیدی، انتہا تو یہ ہے کہ اردو افسانے پر لکھے گئے بیشتر سنجیدہ تحقیقی اور تنقیدی مقالوں میں ان کا سرسری ذکر ہی ملتا ہے اور زیادہ تر ناقدین صرف نام لے لیتے ہیں۔''

(موضوعات، ص، 109، ارتضیٰ کریم)

خواجہ احمد عباس سے متعلق پروفیسر ارتضیٰ کریم کے یہ 1989ء کے خیالات ہیں جو اپنی کتاب ''موضوعات'' میں تحریر کرتے ہیں، لیکن عصر حاضر میں خواجہ احمد عباس پر کئی کتابیں مضامین اور گوشے نکل چکے ہیں مگر تعجب خیز بات یہ ہے کہ آج بھی ان کی تخلیقات، مجموعوں اور افسانوی ادب پر بہت کم کام ہوا ہے۔اگر ہم ان کی افسانہ نگاری کی وسعت کو تسلیم کر لیں تو پتہ چلے گا کہ دیگر افسانہ نگاروں کی مانند ان کی اہمیت مسلم ہے اور جب ہم ان کی ناول نگاری پر نظر

ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی تحریروں میں ترقی پسندی کے عناصر بھی جابجا نظر آتے ہیں ۔ادب میں ان کو الگ الگ میدانوں میں یاد کیا جاتا ہے کوئی ناول نگاری کی داد دیتا ہے تو کوئی افسانہ نگاری کی خصوصیات گناتا ہے اور کوئی صحافتی زندگی کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔اس اعتبار سے کبھی کبھی یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کو کون کون سی صنف میں مہارت حاصل تھی۔پروفیسر ارتضٰی کریم نے منفرد انداز بیان کے ساتھ خواجہ احمد عباس کی ہمہ جہت شخصیت کو اس مضمون میں پیش کیا ہے۔''احمد ندیم قاسمی'' کتاب ''موضوعات'' کا آٹھواں مضمون ہے۔اس مضمون میں پروفیسر ارتضٰی کریم نے احمد ندیم قاسمی کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کے دیہاتیوں کی سادہ زندگی ،ان کے مسائل، دیہی معاشرت و ماحول کی سچی تصویر پیش کی ہیں۔ان کے کلام میں ایسی زندہ جاوید مثالیں مل جاتی ہیں جن میں دیہی دوشیزاؤں کے دل و ذہنی توازن کی ترنگیں مسکراتی نظر آتی ہیں۔نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں۔بوڑھے ماں باپ کی دم توڑتی حسرتیں ہیں اور ان سب میں ایسی رنگینی چھائی ہوئی ہے جو دیہات کے عام لوگوں کی زندگی میں رچی بسی ہوئی ہے۔ارتضٰی کریم نے اپنے تنقیدی وتحقیقی مزاج کے مطابق قاسمی کے افسانوی ادب کو جانچا اور پرکھا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کا افسانوی ادب منشی پریم چند کی مانند دیہات اور دیہات کے مسائل کا حقیقی تجربہ تھا۔جب 1936ء میں ترقی پسند مصنفین کی ادبی تحریک وجود میں آئی تو ڈاکٹر صادق نے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری کو اپنے تجربات کا حصہ بنایا اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہوئے ممتاز افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے افسانوں پر اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا اور یہ پایا کہ ان کے یہاں زندگی کی حقیقتوں کو رومانوی انداز میں محسوس کیا گیا ہے لیکن یہ بھی حق ہے کہ ان کے یہاں دیہاتی مسائل کے ساتھ ساتھ رومان بھی ملتا ہے۔ان کے افسانوں کے کردار رومانی زندگی گزارتے ہیں۔سماجی، معاشی، تہذیبی مسائل کے ساتھ ساتھ رومان ان کی ذہنی تسکین کے اسباب ہیں۔افسانوں میں رومانی جذبات، دیہات کے لوگوں کے احساسات کو متاثر کرتے نظر آتے ہیں بقول پروفیسر ارتضٰی کریم ''رومان کے بغیر ان کے افسانوں کا تصور ہی ممکن نہیں۔ان کے اولین افسانے ''بدنصیب بت تراش'' اور پہلے افسانوی مجموعہ ''چوپال'' سے لے کر ''نیلا پتھر'' تک تمام افسانوں میں سماجی، معاشی ،ثقافتی ،تہذیبی مسائل کے ساتھ رومان کی آمیزش ملتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں روشنی ،محبت اور اندھیرے کی تثلیث ملتی ہے۔محبت سے روشنی ملتی ہے اور اندھیرے نفرت کی

پیداوار ہیں ان کا پورا افسانوی سرمایہ محبت تبلیغ اور انسانیت کی ترویج سے عبارت ہے۔ان کے نزدیک محبت تمام نفرت، انتقام اور جنگ کی آگ سرد کر دیتی ہے۔اس کی مثال ان کے افسانے ''جوانی کا جنازہ'' میں بھی مل جاتی ہے۔'' پروفیسر ارتضیٰ کریم نے احمد ندیم قاسمی کی حیات و جہات کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی پر منشی پریم چند کا کافی اثر تھا جس کی بنا پر پنجاب کے دیہاتی، عوامی، مسائل کو اپنے افسانوں میں استعمال کرنے میں قاسمی کافی کامیاب ہوئے ہیں۔کتاب ''موضوعات'' کا نواں مضمون ''فیض کا تنقیدی رویہ '' ہے۔دراصل فیض احمد فیضؔ نظم کے ممتاز شاعر ہیں اور وہ ہمیشہ اپنے عہد کے شعراء کو سنتے، پسند کرتے اور ان پر شعری گفتگو بھی کرتے تھے۔فیض احمد فیضؔ نے اپنے شعر وادب کا آغاز رومان کی حسین وادیوں سے شروع کیا اور پھر آپ کی آگے کی راہ رومان سے انقلاب کی جانب جاتی ہے انہوں نے غزل کے کئی موضوعات پر طبع آزمائی کی اور غزل کو وسعت بخشی۔افسانوی ادب میں افسانے اور ناولوں پر گفتگو کی۔سرشارؔ کی ناول نگاری پر تنقیدی مضامین تحریر کئے۔ترقی پسند تحریک کے مصنفین نے جب امرتسر اور لاہور کا دورہ کیا تو وہاں فیض احمد فیضؔ، محمود الظفر رشید جہاں، اختر شیرانی، غلام مصطفیٰ وغیرہ ترقی پسند تحریک کی مہم کو جلا بخشی۔فیض احمد فیضؔ اس تحریک کے اہم رکن تھے۔اسی لئے فیض کو ترقی پسند شاعر بھی کہتے ہیں۔ان کی شاعری میں فلسفیانہ جھلک نظر آتی ہے۔ملک وقوم کی ہمدردی ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔سیاسی سماجی مسائل پر خوب شاعری کی۔لوگوں کو تخیلات سے باہر کیا۔وہ ملک کے مسائل اور غریب مزدوروں کے لئے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔فیض احمد فیض کی ہمہ جہت شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں:

> ''فیض نے نظریاتی مسائل پر بھی لکھا ہے اور سیاسی و سماجی موضوعات پر بھی، معاصرین اور متقدمین کی تخلیقات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔اردو ناول اور افسانے پر بھی گفتگو کی۔انہوں نے ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے علمبرداروں پر بھی خامۂ فرسائی کی ہے۔اس اعتبار سے ان کے مضامین میں تنوع کا احساس ہوتا ہے۔یوں بھی جن لوگوں نے فیضؔ کو قریب سے دیکھا ہے۔ان کے ساتھ نشست و برخاست کی ہے وہ فیضؔ کے مزاج سے واقف ہیں کہ وہ کس قدر خوش مزاج، کشادہ ذہن، وسیع النظر اور وسیع المطالعہ شخص تھے۔بغیر کسی تعصب کے وہ اپنے عہد کے

شاعروں اور نئے شاعروں پر بھی گفتگو فرماتے تھے۔''

(موضوعات، ارتضیٰ کریم، ص، 127)

''ترقی پسند تحریک کی وراثت'' پروفیسر ارتضیٰ کریم کی کتاب ''موضوعات'' کا دسواں مضمون ہے۔اس مضمون میں موضوف نے بڑی حسن اسلوبی کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے بعد کے حالات کی عکاسی منفرد انداز میں کی ہے۔اور یہ نتیجہ نکالنے کی پرزور کوشش کی ہے کہ کسی بھی تحریک کے فروغ میں عمدہ تنظیم کا ہونا لازم وملزوم ہے۔بنا تنظیم کے کوئی بھی تحریک منزل مقصود کو حاصل نہیں کرسکتی۔بقول پروفیسر ارتضیٰ کریم ''تنظیم کے بغیر تحریک پنپ نہیں سکتی۔ترقی پسند تحریک کی مقبولیت میں جہاں اور دوسرے عوامل کارفرما تھے ان میں ایک بڑی وجہ سجاد ظہیر کی تنظیمی صلاحیت بھی تھی'' اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک ایک ایسی بامقصد تحریک تھی جو ہمیشہ سماج میں امن وسکون پیدا کرنا چاہتی تھی۔تحریک سے جڑے ادباء اور شعراء نے سماج میں اونچ نیچ کے فرق کو دور کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی۔مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم بڑے بڑے اسٹیج پر بیٹھ کر کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں۔خوبصورت لبھانے والی باتیں تو زبان سے ادا کردیتے ہیں۔مگر خود ان پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔صرف دوسروں کو عمل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔اگر ہم ایسے دوہرے مزاج کے ساتھ لوگوں کو سماجی معاشی برائیوں سے دور کرنے کی تلقین کریں گے تو ظاہر ہے کہ عنقریب ہی ہم معاشرہ کو خراب کردیں گے۔ ہر ایک شاعر یا ادیب کو ترقی پسند تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ہر ایک ادیب کی تصنیف کو ترقی پسند تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے کسی بھی شاعر یا ادیب کے فن پارے کو معتبر تصنیف قرار دینے کا کام تخلیق کار کا نہیں ہوتا۔اور یہ بھی جانب حق ہے کہ ترقی پسند ادیب کی کسی بھی تصنیف کو ترقی پسند تخلیق نہیں سمجھنا چاہیے۔یہ سچ ہے کہ کسی بھی تصنیف میں اندرونی اور باہری خصوصیات وکمزوریوں کو بھی اُجاگر کرنا چاہے تبھی کسی ترقی پسند ادیب کی تصنیف ترقی پسند تخلیق کہلانے کا حق رکھتی ہے۔''جدید تنقید کا منظرنامہ'' عصر حاضر کے معتبر ناقد ارتضیٰ کریم کی تنقیدی وتحقیقی تصنیف ہے۔اس تصنیف میں تنقید کے تمام پہلوؤں پر بھرپور مضامین تحریر کئے گئے ہیں۔ان مضامین میں محمد حسن کا مضمون ''مارکسی نظریۂ تنقید'' کے نام سے تحریر کیا گیا ہے۔اس مضمون میں محمد حسن لکھتے ہیں:

> ''کسی بھی فن پارے کو پرکھتے ہیں تو اسکی تعریف، تنقید یا تنقیص کرتے ہوئے ان کا مطالعہ اور ہر ایک بیان حقیقی اور مستقل بالذات ہونے کے ساتھ ہی اضافی اور متعلق ہوتا ہے۔جب وہ کسی چیز کو اچھا کہتے ہیں تو ان کے ذہن

میں اس جنس کی اور بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔جن کے مقابلے میں انہوں نے اسے بہتر درجہ دیا ہے۔بقول سنپوزاہر ایک شے کی تعریف دراصل ایک نفی ہے۔جب ہم کسی شے کی تعریف یا ماہیت بیان کرتے ہیں تو اس کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ ہم یہ بتا رہے ہیں کہ اس شے میں یہ تمام صفات پائی جاتی ہیں۔جو اس مقدار میں دوسری اشیا میں نہیں ملتیں۔''

(جدید تنقید کا منظر نامہ،ص 371)

تعجب خیز بات ہے کہ اکثر لوگ خود اپنے حرکت وعمل کو چھوڑ کر دوسروں سے عمل کرانا چاہتے ہیں۔اپنی فکری رعنائیوں کو دوسروں پر ڈال کر اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ایسے کام کو انجام دینے والے ادب کے ساتھ انصاف نہ کرنے کا کام کرتے ہیں۔انسان کے اس دوہرے رویے کو دیکھتے ہوئے اور عمل سے فارغ ہوکر دوسروں کو تلقین کرتے ہوئے جب ایک دانشور یا ادیب اپنے خیالات پیش کرتا ہے تو قارئین کو بھی ادب کی راہ سے بھٹکا دیتا ہے بقول اقبال ۔

قوت فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے
پھر کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے

پروفیسر ارتضٰی کریم کی تنقیدی نظر دیکھئے کہ انہوں نے معاشرہ کی منتشر ہوتی ہوئی حالت زار کو بخوبی سمجھ لیا۔انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ سماج میں لوگ مذہب کے نام پر جھگڑ رہے ہیں۔لباس سے لوگوں کی شناخت کی جارہی ہے۔لوگ زبان بندی کے گروہوں میں بٹ رہے ہیں۔قوم اور برادری کے نام پر لوگ فرقہ پرستی کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔مذہت کے نام پر احتجاج ہورہا ہے۔جب سماج میں اونچ نیچ اور فرقہ پرستی کی آگ چاروں سمت پھیل رہی ہو تو بھلا ہم ترقی پسند کیسے ہو سکتے ہیں۔بقول ارتضٰی کریم ''انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنی ابتداء سے اسی بات کی کوشش کی ہے کہ دنیا سے فرقہ واریت،طبقاتی ناہمواری،حرص اقتدار،سماجی اور سیاسی استحصال اور ایسی دیگر سماجی برائیوں کو دور کیا جائے،لیکن ایسا لگتا ہے کہ خود انجمن کے ایسے ادیب اور شاعر،دانشور اور مصلح دوہری شخصیت کے مالک ہیں۔ہم زبان کے نام پر،لباس اور مذہب کے نام پر قوم اور صوبہ کے نام پر اگر الگ ہوجاتے ہیں تو ہمیں اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہوئے شرمانا چاہیے۔''

حسرت موہانی ''کتاب موضوعات'' کا گیارواں مضمون ہے۔بیسویں صدی میں

جب علامہ اقبال، چکبست اپنی شاعری کے ذریعہ عوام میں بے داری، فلسفۂ خودی اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا کر رہے تھے تو ان شعراء کے ذرا بعد جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری وغیرہ کا کلام عوام کو انقلابی جذبوں سے معمور کر رہا تھا۔ شاعری کے میدان میں حسرت موہانی دیگر شعراء سے ذرا الگ نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کے تعمیر کردہ رشتوں پر اپنے پیر نہیں جمائے بلکہ اپنی شاعرانہ طبیعت میں صوفیانہ مزاج اور حسن حقیقی کے موضوعات کا وہ احاطہ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ حسرت موہانی نے اپنے شعری کلام سے غزل کے جسم میں نیا خون پیدا کیا۔ انہوں نے دیگر شعراء کی مانند روایت پرستی کو نہیں اپنایا بلکہ اپنے لئے نئی راہیں ہموار کیں۔ غزل کو صرف حسن و عشق کی حد تک ہی نہیں رکھا بلکہ زندگی کی اصل حقیقت سے آنکھیں ملانا بھی سکھایا۔ اس لئے آج ہم دیکھتے ہیں کہ عہد حاضر میں غزل میں سیاسی، سماجی، معاشی حالات و خیالات کی عکاسی ملتی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کا یہ اقتباس دیکھئے:

> ''حسرت نے اپنے اسلاف کی طرح گل و بلبل کی کہانی نہیں چھیڑی اور قصہ چشم و رخسار سے اجتناب کی خواہش ظاہر کی۔ مگر حسرتؔ صوفی کا دل لے کر پیدا ہوئے تھے، حسن مجازی میں حسن حقیقی کے متلاشی تھے۔ اسی لئے انہوں نے غزل میں اپنے زمانے کی عام نہج سے ہٹ کر ایک راہ بنائی۔''

(موضوعات، ص، 145، ارتضیٰ کریم)

نظیر اکبر آبادی کی کتاب ''موضوعات'' کا بارھواں اور آخری باب ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ انہوں نے نظم، غزل، مثنوی، قطعہ، رباعی، وغیرہ میں طبع آزمائی کی مگر خاص طور پر وہ نظم گو شاعر ہیں۔ ان کی نظموں میں انسانی قدریں، حسن اخلاق، مشترکہ تہذیب کی سچی تصاویر ملتی ہیں۔ انہوں نے عوام کے دکھ سکھ، میلوں ٹھیلوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، ہولی، دیوالی، عید، گرمی، برسات، جاڑا، وغیرہ پر آپ نے خوبصورت نظمیں تحریر کی ہیں۔ بنجارہ نامہ، برسات، آدمی نامہ، ہولی کی بہاریں، روٹی نامہ وغیرہ ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ جن میں نظیر اکبر آبادی نے اعلیٰ اخلاقیت، تہذیبی قدریں اور گاؤں دیہات کے موسم بہار کی کیفیت کو منفرد لب و لہجہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی شاعری کی نظیر ملنا تھوڑا دشوار ہے۔

نظیر اکبر آبادی وطن سے محبت کرتے تھے۔ ہندوستانی رسم و راج، عقائد اور شادی بیاہ کی تقریبات کو شاعری کا موضوع بناتے تھے۔ سماج کے لوگ ان کی شاعری میں اپنے سماجی رسوم

اور تقریبات کی تصاویر دیکھتے تھے۔معاشرت کے تمام حالات سیاسیات احساسات کو اپنی شاعری میں شامل رکھتے تھے۔نیاز فتح پوری کا یہ اقتباس دیکھئے:

''نظیر کا کلیات ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو معیشت ،معاشرت کا کوئی انداز اور احساسات وتاثرات کا کوئی ایسا منظر نہیں جو اس میں موجود نہ ہو۔اور عالم محسوسات کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس کا ذکر کسی نہ کسی نہج سے نظیر نے نہ کیا ہو۔''

(نظیر میری نظر میں، نیاز فتح پوری،ص، 87 نظیر نامہ شمس الحق عثمانی،1979)

نظیر اکبرآبادی نے چاہے نظم لکھی ہو یا غزل یا دیگر اصناف،اپنے تمام کلام میں شاعر نے وطن پرستی،زندگی کی خوشیاں اور غم،تیوہار اور رسومات کو دلچسپی کے ساتھ پیش کیا ہے۔وہ ملک سے سچی محبت کرتے ہیں اور اپنے قاری کو بھی وطن سے محبت کی تعلیم دیتے ہیں۔مجنو گورکھپوری کتاب ''ادب اور زندگی'' کے صفحہ نمبر دوسواٹھاسی پر رقم طراز ہیں۔''نظیر خالص ہندوستانی شاعر تھے۔ہندوستانی زندگی اور ہندوستان کے رسوم وروایات ان کی شاعری کے لازمی عناصر ہیں وہ اپنی گردوپیش کی زندگی کے عام سے عام واقعات کے ساتھ سچی موانست رکھتے ہیں۔اور انہیں سے اپنی شاعری کے لئے مواد حاصل کرتے ہیں''نظیر نے کبھی بھی فرقہ پرستی،تعصب، ذات پات،مذہب اور ملت کو تعصب کی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی اپنے کلام میں کہیں بھی تعصب کو جگہ دی ہے۔وہ مندر مسجد اور ہندو مسلم میں فرق محسوس نہیں کرتے بلکہ سب کو احترام کے ساتھ شاعری میں پیش کرتے ہیں۔مخمور اکبرآبادی کا یہ اقتباس دیکھئے:

''نظیر کے اخلاق کا سب سے تاباں جوہر ان کی بے تعصبی ہے۔اگر وہ کسی جگہ اسلامی معاشرت کے کسی صیغہ پر روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری جگہ فوراً ہی ہندو سوسائٹی کے ہم رتبہ وہم رنگ شعبے کا تذکرہ اسی حیثیت سے اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں مثلاً ایک مصرع میں مسجد کا ذکر ہے تو دوسرے میں مندر کا ذکر لازمی ہے۔''

(روح نظیر مخمور اکبرآبادی،ص،19،گیا پرشاد اینڈ سنس آگرہ1946)

نظیر اکبرآبادی کی شاعرانہ عظمت پر جب عمیق نظر ڈالتے ہیں تو ان کے کلام میں عوامی زندگی ،مصلح پسندی، تلخ حقائق، ہندوستانی زندگی،بازاری اداکاریاں، انسانیت کی پیغمبری،امیری غریبی،انسانی نابرابری کا احتجاج، مذہب ملت کی تفریق،عوامی دوستی کی تعلیم ،

مذہبی عقائد، ذات برادری، طبقات، عوام کے رنج وغم قومی یکجہتی کی خوبصورت مثالیں جابجا نظر آتی ہیں۔مگر تعجب خیز بات یہ ہے کہ اردو ناقدین نے ان کو اپنی توجہ سے دور رکھا۔صرف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ ''گلشن بے خار'' ایک ایسا اہم تذکرہ ہے جس میں نظیر اکبر آبادی کی نظیر ملتی ہے۔شیفتہ کے تذکرہ کے علاوہ صرف ''گلشن بے خزاں'' اور ''زندگانی بے نظیر'' میں نظیر اکبر آبادی کی غزلیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان کو عوامی شاعر یا اہم نظم نگار شاعر تو تقریباً سبھی نے تسلم کیا مگر ان کی ادبی خدمات پر بھرپور روشنی نہیں ڈالی گئی۔نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری سے زیادہ غزل گوئی کو پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنی توجہ کا نشانہ بنایا اور ان کو عام نظم گو شاعر کے ساتھ ساتھ غزل گو شاعر تسلم کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

> ''افسوس، کہ نظیر اردو شاعری کا جس قدر اہم شاعر ہے، ناقدین ادب نے اس سے اتنی ہی بے اعتنائی برتی۔اردو کے تذکروں میں نظیر کا ذکر خال خال ہی ملتا ہے۔۔۔۔محمد حسین آزاد نے جانے کیو ''آب حیات'' میں نظیر کی جانب سے توجہی برتی؟ جبکہ انہوں نے جرأت، انشاء، مصحفی وغیرہ کے کلام پر باتیں کی ہیں۔۔۔۔وجہ یہ ہے کہ کم وبیش تمام ناقدین ادب نے نظیر کی نظم نگاری پر ہی اظہار خیال کیا ہے حالانکہ انکی غزلوں کی تعداد نظموں سے کہیں زیادہ ہے۔مگر وہ غزل گو کی حیثیت سے اتنے مقبول نہیں جتنے بحیثیت نظم نگار۔''

(موضوعات،169)

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی مندرجہ بالا تنقیدی تصانیف کا مطالعہ کرنے پر شعور جاگتا ہے کہ موصوف کی تحقیقی تنقیدی تصانیف دستاویزی حیثیت کی حامل ہیں۔جن میں فکشن تنقید کے ناقدین اور ان کی ادبی خدمات کو ارتضیٰ کریم نے ناقدانہ عرق ریزی سے پیش کیا ہے۔ان کی تنقیدی نگارشات میں یہ بھی حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ عصر حاضر میں پروفیسر ارتضیٰ کریم تحقیق و تنقید نگاری کی ایک محترم ومنفرد آواز ہیں۔موصوف کی تحقیقی وتنقیدی کتابیات میں تہذیبی شعور کا احساس، تاریخی توازن کا رجحان، تنقیدی اصولوں کی بازیافت دکھائی دیتی ہے۔آپ نے اپنی حیات کا لمحہ لمحہ علمی وادبی کاموں میں صرف کیا۔ان تصانیف کا مطالعہ قارئین کو یہ احساس کرا دیتا ہے کہ آپ ایک اہم شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کے تنقید نگار بھی ہیں۔فکشن تنقید پر ان کی کتابیات نے شہرت عام وبقائے دوام کی سرحد کو چھولیا ہے۔ان کی

زبان و بیان میں بڑی وسعت ہے۔ عام فہم الفاظ اور شیریں زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ خیالات کو لفظوں کا جامہ بڑی فنکاری سے پہناتے ہیں جس کو غالبؔ نے کہیں بیاں، تو کہیں انداز بیاں کے نام سے پیش کیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد عیاں ہوتا ہے کہ پروفیسر ارتضیٰ کریم فکشن تنقید کی ایک معتبر آواز ہیں۔ عصر حاضر میں جب بھی فکشن کے اہم ناقدین پر تبصرہ کیا جائے گا فکشن تنقید کی معتبر آواز بن کر موصوف اگلی صف میں کھڑے نظر آئیں گے۔

☆☆☆